وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

"جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ بھلائی کے ساتھ ان کے پیروکار ہیں، اللہ ان سب سے راضی ہوگیا اور وہ سب اس سے راضی ہوگئے"

رسوماتِ محرم الحرام

اور

سانحہ کربلا

حافظ صلاح الدین یوسف



دار السلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ بھلائی کے ساتھ ان کے پیروکار ہیں، اللہ ان سب سے راضی ہوگیا اور وہ اس سے راضی ہوگئے



رُسُوماتِ مُحرّم الحرام

اور

سانحہ کربلا

حافظ صلاح الدین یوسف



دارُالسّلام
کتاب و سُنّت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • شارجہ • لاہور
لندن • ہیوسٹن • نیویارک



دارُالسّلام

کتاب و سُنّت کی اشاعت کا عالمی اِدارہ

ریاض • جدہ • شارجہ • لاھور

لندن • ھیوسٹن • نیو یارک

[redacted]

پوسٹ بکس :22743 الریاض :11416 سعودی عرب

فون :4021659-4033962 00966 1 4043432 فیکس :4021659

E-mail: *darussalam@awalnet.net.sa*

Website: *www.dar-us-salam.com*

---

❶ طریق مکہ ۔ العلیا ۔ الریاض فون :4614483 1 00966 فیکس :4644945

❷ شارع الاربعین ۔ المسلز ۔ الریاض فون :4735220 فیکس :4735221

❸ جدّہ فون :6879254 2 00966 فیکس :6336270

❹ الخُبر فون :8692900 3 00966 فیکس :8691551

شارجہ فون :5632623 6 00971 فیکس :5632624

پاکستان (ہیڈ آفس و مرکزی شوروم)

❶ 36 - لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور

فون :7110081-7111023-7232400-7240024 42 0092

فیکس :7354072 **E-mail:** *darussalampk@hotmail.com*

❷ غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور فون :7120054 فیکس :7320703

❸ اُردو بازار گوجرانوالا فون :741613-431-0092 فیکس :741614

لندن فون :5202666 208 0044 فیکس :5217645 208

امریکہ ❶ ہوسٹن فون :7220419 713 001 فیکس :7220431

❷ نیو یارک فون :6255925 718 001 فیکس :6251511

فہرست



عرضِ مؤلّف

یہ کتاب راقم کے چند مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور میں شائع ہوئے۔ موضوع ان سب کا ماہ محرم اور اس سے متعلقہ مباحث ومسائل ہیں۔ (ایک فاضلانہ مقالہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی اس کی اہمیت اور موضوع کی مناسبت سے اس میں شامل کر دیا گیا ہے) جن احباب اور بزرگوں کی نظروں سے یہ مضامین گزرے ہیں ان کی خواہش تھی کہ یہ الگ کتابی شکل میں شائع ہو جائیں تاکہ ان کی اہمیت مستقل اور ان کا دائرۂ استفادہ وسیع ہو جائے اَلْحَمْدُ لِلّٰه ان کی خواہش کی تکمیل کا سروسامان بہم پہنچ گیا ہے اور اب انہیں بعض ضروری اور مفید اضافوں کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ ان مضامین کے مخاطب اہل سنت کے وہ علما اور عوام ہیں جو شعوری یا غیر شعوری طور پر شیعیت کے مسموم اثرات سے متاثر ہیں۔ اور ان کا طرزِ عمل و فکر رِفض و تَشَیُّع کے فروغ کا باعث ہے۔ ہم نے علم و عقل کی روشنی میں ان کو دعوت فکر دی ہے تاکہ وہ سنجیدگی سے موروثی نظریات پر نظر ثانی کر سکیں۔ اللہ کرے کہ ان مضامین میں جو جذبۂ ہمدردی کار فرما ہے وہ مؤثر ثابت ہو اور فکر و نظر کی کجیوں کو دور کرنے کا باعث ہو۔

ایں دعاء از من و از جملہ جہاں آمین باد!

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۳۹۹ھ میں بعنوان "ماہ محرم اور موجودہ مسلمان" چھپا تھا' اس وقت سے اب تک اسی عنوان سے پاک و ہند سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اَلْحَمْدُ لِلّٰه عوام و خواص میں اس کو خوب پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ تاہم اس میں ایک کمی محسوس ہوتی تھی اور وہ تھی "واقعہ کربلا کا پس منظر اور اس کے اہم اسباب۔"

سالہا سال سے یہ کتاب تو شائع ہو رہی تھی اور اس میں ساری گفتگو بھی اسی موضوع کے متعلقہ مباحث پر ہے' لیکن اصل واقعے کی تفصیلات نہ ہونے کی وجہ سے کتاب میں ایک تشنگی موجود تھی۔

اس ایڈیشن میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس تشنگی اور کمی کا بھی ازالہ "سانحۂ کربلا - پس منظر اور اہم اسباب" کے عنوان سے' ایک باب کا اضافہ کر کے' کر دیا گیا ہے۔ اور اب یہ کتاب "رسوماتِ محرم الحرام اور سانحۂ کربلا" کے نئے عنوان سے چھپ رہی ہے۔

علاوہ ازیں اب یہ اضافہ شدہ ایڈیشن' اسلامی کتابوں کی نشر و اشاعت کے عالمی ادارے دارالسلام الریاض - لاہور کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔ ادارے نے اپنی روایات کے مطابق اس کی تحقیق کے معیار کو مزید بلند اور طباعت کے حسن کو دوچند بلکہ دہ چند کر دیا ہے۔ اس کے لیے راقم ادارے کے سینئر رفیق مولانا محمد عبدالجبار اور حافظ عبدالعظیم اسد حفظهما اللہ کا شکر گزار ہے۔ اوّل الذکر فاضل رفیق نے اس کی تصحیح و تحقیق میں ثانی الذکر عزیز موصوف نے اس کے گیسوئے طباعت کی تزئین و آرائش میں خوب خوب محنت کی ہے۔ جزاهما اللہ احسن الجزاء.

اس لحاظ سے یہ ایڈیشن' سابقہ تمام ایڈیشنوں کے مقابلے میں' زیادہ مفید' بہتر اور ظاہری و معنوی محاسن سے آراستہ ہے۔

صلاح الدین یوسف

مدیر: شعبۂ ترجمہ و تحقیق و تصنیف

دارالسلام - لاہور

ذوالحجہ ۱۴۲۲ھ - فروری ۲۰۰۲ء



-- ۱ --

محرم الحرام -- سن ہجری کا آغاز

سانحۂ کربلا کا اس کی حرمت سے کوئی تعلق نہیں!

ماہ محرم سن ہجری کا پہلا مہینہ ہے جس کی بنیاد تو آنحضرت ﷺ کے واقعۂ ہجرت پر ہے لیکن اس اسلامی سن کا تقرر اور آغازِ استعمال ۱۷ھ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت سے ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ یمن کے گورنر تھے ان کے پاس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان آتے تھے جن پر تاریخ درج نہ ہوتی تھی ۱۷ھ میں حضرت ابو موسی کے توجہ دلانے پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صحابہ کو اپنے ہاں جمع فرمایا اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا' تبادلۂ افکار کے بعد قرار پایا کہ اپنے سن تاریخ کی بنیاد واقعہ ہجرت کو بنایا جائے اور اس کی ابتداء ماہ محرم سے کی جائے کیونکہ ۱۳ نبوت کے ذوالحجہ کے بالکل آخر میں مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا منصوبہ طے کر لیا گیا تھا اور اس کے بعد جو چاند طلوع ہوا وہ محرم کا تھا۔ (فتح الباری' باب التاریخ و من أین أرخو التاریخ؟ ج ۷/ ۳۳۴' حدیث: ۳۹۳۴' طبع دار السلام)

مسلمانوں کا یہ اسلامی سن بھی اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے ایک خاص امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ مذاہب عالم میں اس وقت جس قدر سنین مروج ہیں وہ عام طور پر یا تو کسی مشہور انسان کے یوم ولادت کو یاد دلاتے ہیں یا کسی قومی واقعۂ مسرت و شادمانی سے وابستہ ہیں کہ جس سے نسل انسانی کو بظاہر کوئی فائدہ نہیں' مثلاً مسیحی سن کی بنیاد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یوم ولادت ہے۔ یہودی سن فلسطین پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی تخت نشینی کے ایک پر شوکت واقعے سے وابستہ ہے۔ بکرمی سن راجہ بکرما جیت کی پیدائش کی یادگار ہے' رومی سن سکندر فاتح اعظم کی پیدائش کو واضح کرتا ہے' لیکن اسلامی سن ہجری عہد نبوت

کے ایسے واقعے سے وابستہ ہے جس میں یہ سبق پنہاں ہے کہ اگر مسلمان اعلائے کلمۃ الحق کے نتیجے میں تمام اطراف سے مصائب و آلام میں گھر جائے' بستی کے تمام لوگ اس کے دشمن اور درپئے آزار ہو جائیں' قریبی رشتہ دار اور خویش و اقارب بھی اس کو ختم کرنے کا عزم کرلیں' اس کے دوست احباب بھی اسی طرح تکالیف میں مبتلا کر دیئے جائیں' شہر کے تمام سربرآوردہ لوگ اس کو قتل کرنے کا منصوبہ باندھ لیں' اس پر عرصۂ حیات ہر طرح سے تنگ کر دیا جائے اور اس کی آواز کو جبراً روکنے کی کوشش کی جائے تو اس وقت وہ مسلمان کیا کرے؟ اس کا حل اسلام نے یہ تجویز نہیں کیا کہ کفروباطل کے ساتھ مصالحت کر لی جائے' تبلیغ حق میں مداہنت اور رواداری سے کام لیا جائے اور اپنے عقائد و نظریات میں لچک پیدا کر کے ان میں گھل مل جائے تاکہ مخالفت کا زور ٹوٹ جائے۔ بلکہ اس کا حل اسلام نے یہ تجویز کیا ہے کہ ایسی بستی اور شہر پر حجت تمام کر کے وہاں سے ہجرت اختیار کر لی جائے۔

چنانچہ اسی واقعۂ ہجرت نبوی پر سن ہجری کی بنیاد رکھی گئی ہے جو نہ تو کسی انسانی برتری اور تَفَوُّق کو یاد دلاتا ہے اور نہ شوکت و عظمت کے کسی واقعے کو' بلکہ یہ واقعۂ ہجرت مظلومی اور بے کسی کی ایک ایسی یادگار ہے کہ جو ثبات قدم' صبرواستقامت اور راضی برضائے الٰہی ہونے کی ایک زبردست مثال اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے۔ یہ واقعۂ ہجرت بتلاتا ہے کہ ایک مظلوم و بے کس انسان کس طرح اپنے مشن میں کامیاب ہو سکتا ہے اور مصائب و آلام سے نکل کر کس طرح کامرانی و شادمانی کا زریں تاج اپنے سر پر رکھ سکتا ہے اور پستی و گمنامی سے نکل کر رفعت و شہرت اور عزت و عظمت کے بام عروج پر پہنچ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ مہینہ حرمت والا ہے اور اس ماہ میں نفل روزے اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں جیسا کہ حدیث نبوی ﷺ میں ہے۔ (یہ حدیث آگے آئے گی)

یہ بھی خیال رہے کہ اس مہینے کی حرمت کا سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے واقعۂ شہادت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مہینہ اس لیے قابل احترام ہے کہ اس میں حضرت حسین کی شہادت کا سانحۂ دلگداز پیش آیا تھا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ یہ

سانحہ شہادت تو حضور اکرم ﷺ کی وفات سے پچاس سال بعد پیش آیا اور دین کی تکمیل آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ہی کر دی گئی تھی۔

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ (المائدۃ ۵/ ۳)

اس لیے یہ تصور اس آیت قرآنی کے سراسر خلاف ہے' پھر خود اسی مہینے میں اس سے بڑھ کر ایک اور سانحہ شہادت اور واقعہ عظیم پیش آیا تھا یعنی یکم محرم کو عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ۔ اگر بعد میں ہونے والی ان شہادتوں کی شرعاً کوئی حیثیت ہوتی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت اس لائق تھی کہ اہل اسلام اس کا اعتبار کرتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ایسی تھی کہ اس کی یادگار منائی جاتی اور پھر ان شہادتوں کی بنا پر اگر اسلام میں ماتم و شیون کی اجازت ہوتی تو یقیناً تاریخ اسلام کی یہ دونوں شہادتیں ایسی تھیں کہ اہل اسلام ان پر جتنی بھی سینہ کوبی اور ماتم و گریہ زاری کرتے' کم ہوتا۔ لیکن ایک تو اسلام میں اس ماتم و گریہ زاری کی اجازت نہیں' دوسرے یہ تمام واقعات تکمیل دین کے بعد پیش آئے ہیں اس لیے ان کی یاد میں مجالس عزا اور محافل ماتم قائم کرنا دین میں اضافہ ہے جس کے ہم قطعاً مجاز نہیں۔



-- ۲ --

عشرۂ محرم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا احترام مطلوب

عشرۂ محرم میں عام دستور و رواج ہے کہ شیعی اثرات کے زیر اثر واقعات کربلا کو مخصوص رنگ اور افسانوی و دیومالائی انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ شیعی ذاکرین تو اس ضمن میں جو کچھ کرتے ہیں وہ عالم آشکارا ہے' لیکن بد قسمتی سے بہت سے اہل سنت کے واعظان خوش گفتار اور خطیبان سحربیان بھی گرمیٔ محفل اور عوام سے داد و تحسین وصول کرنے کے لیے اسی تال سر میں ان واقعات کا تذکرہ کرتے ہیں جو شیعیت کی مخصوص ایجاد اور ان کی انفرادیت کا غماز ہے اس سانحۂ شہادت کا ایک پہلو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر تبرا بازی ہے جس کے بغیر شیعوں کی "محفل ماتم حسین رضی اللہ عنہ" مکمل نہیں ہوتی۔ اہل سنت اس پستی و کمینگی تک تو نہیں اترتے تاہم بعض لوگ بوجوہ بعض صحابہ پر کچھ نکتہ چینی کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے' مثلاً ایک "مفکر" نے تو یہاں تک فرما دیا کہ قلیل الصحبت ہونے کی وجہ سے ان کی قلب ماہیت نعوذ باللہ نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تمام اعلیٰ و ادنیٰ صحابہ کا فرق مراتب کے باوصف بحیثیت صحابی ہونے کے یکساں عزت و احترام اسلام کا مطلوب ہے۔ کسی صحابی کے حقوق میں زبان طعن و تشنیع کھولنا اور ریسرچ کے عنوان پر نکتہ چینی کرنا ہلاکت و تباہی کے خطرے کو دعوت دینا ہے۔

صحابی کی تعریف ہر اس شخص پر صادق آتی ہے جس نے ایمان کی حالت میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو اور قرآن و حدیث میں صحابۂ کرام کے جو عمومی فضائل و مناقب بیان کیے گئے ہیں' ان کا اطلاق بھی ہر صحابی پر ہو گا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے الاصابہ میں صحابی کی جس تعریف کو سب سے زیادہ صحیح اور جامع قرار دیا ہے۔ وہ یہ ہے:

«وَأَصَحُّ مَا وَقَفْتُ عَلَيْهِ مِنْ ذٰلِكَ أَنَّ الصَّحَابِيَّ مَنْ لَقِيَ النَّبِيَّ ﷺ مُؤْمِنًا بِهٖ وَمَاتَ عَلَى الإِسْلَامِ، فَيَدْخُلُ فِيمَنْ لَقِيَهُ مَنْ طَالَتْ مُجَالَسَتُهُ لَهُ أَوْ قَصُرَتْ وَمَنْ رَوٰى عَنْهُ أَوْ لَمْ يَرْوِ وَمَنْ غَزَا مَعَهُ أَوْ لَمْ يَغْزُ وَمَنْ رَاٰهُ رُؤْيَةً وَلَوْ لَمْ يُجَالِسْهُ وَمَنْ لَّمْ يَرَهُ بِعَارِضٍ كَالْعَمٰى»(الإصابة في تمييز الصحابة: ١/١٥٨، طبع دارالكتب العلمية: ١٩٩٥ء)

''سب سے زیادہ صحیح تعریف صحابی کی جس پر میں مطلع ہوا وہ یہ ہے کہ ''وہ شخص جس نے ایمان کی حالت میں حضور ﷺ سے ملاقات کی اور اسلام ہی پر اس کی موت ہوئی۔'' پس اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جس نے نبی ﷺ سے ملاقات کی (قطع نظر اس سے کہ) اسے آپ کی ہم نشینی کا شرف زیادہ حاصل رہا یا کم' آپ سے روایت کی یا نہ کی۔ آپ کے ساتھ غزوے میں شریک ہوا یا نہیں اور جس نے آپ کو صرف ایک نظر ہی سے دیکھا ہو اور آپ کی مجالس' ہم نشینی کی سعادت کا موقع اسے نہ ملا ہو اور جو کسی خاص سبب کی بنا پر آپ کی رؤیت کا شرف حاصل نہ کر سکا ہو جیسے نابینا پن۔''

اس لیے اہل سنت کا خلفاء اربعہ ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضی اللہ عنہم اور دیگران جیسے اکابر صحابہ کی عزت و توقیر کو ملحوظ رکھنا لیکن بعض ان جلیل القدر اصحاب رسول کی منقبت و تقدیس کا خیال نہ رکھنا یا کم از کم انہیں احترام مطلوب کا مستحق نہ سمجھنا جن کے اسمائے گرامی مشاجرات کے سلسلے میں آتے ہیں جیسے حضرت معاویہ' حضرت عمرو بن العاص' حضرت مغیرہ بن شعبہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں' یکسر غلط اور رفض و تشیع کا ایک حصہ ہے۔ اہل سنت کو اس نکتے پر غور کرنا چاہیے کہ خلفائے راشدین کی عزت و توقیر تو کسی حد تک معقولیت پسند شیعہ حضرات بھی ملحوظ رکھنے پر مجبور ہیں اور ان کا ذکر وہ نامناسب انداز میں کرنے سے بالعموم گریز ہی کرتے ہیں البتہ حضرت معاویہ' عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما وغیرہ کو وہ بھی معاف نہیں کرتے اگر صحابۂ کرام کے نام لیوا بھی یہی موقف اختیار کر لیں' تو پھر محبان صحابہ اور دشمنان صحابہ میں فرق کیا رہ جاتا ہے؟ اور ان صحابہ کو احترام مطلوب سے فروتر خیال کر کے ان کے شرف و فضل کو مجروح کرنا کیا صحابیت کے قصر رفیع میں نقب زنی

کا ارتکاب نہیں ہے؟ کیا اس طرح نفس صحابیت کا تقدس مجروح نہیں ہوتا؟ اور صحابیت کی ردائے عظمت (معاذ اللہ) تار تار نہیں ہوتی؟

بہرحال ہم عرض یہ کر رہے تھے کہ قرآن و حدیث میں صحابۂ کرام کے جو عمومی فضائل و مناقب مذکور ہیں وہ تمام صحابہ کو محیط و شامل ہیں اس میں قطعاً کسی استثناء کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور ان نصوص کی وجہ سے ہم اس امر کے پابند ہیں کہ تمام صحابہ کو نفس صحابیت کے احترام میں یکساں عزت و احترام کا مستحق سمجھیں' اس سلسلے میں یہ حدیث ہر وقت ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لاَ تَسُبُّوْا أَصْحَابِيْ فَلَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ اَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلاَ نَصِيْفَهُ»(صحيح البخاري، فضائل أصحاب النبي ﷺ، ح:٣٦٧٣ وصحيح مسلم، فضائل الصحابة، ح: ٢٥٤٠ـ٢٥٤١)

"میرے صحابہ پر سب و شتم نہ کرو (یعنی انہیں جرح و تنقید اور برائی کا ہدف نہ بناؤ) انہیں اللہ نے اتنا بلند رتبہ عطا فرمایا ہے) کہ تم میں سے کوئی شخص اگر احد پہاڑ جتنا سونا بھی اللہ کی راہ میں خرچ کر دے تو وہ کسی صحابی کے خرچ کردہ ایک مُد (تقریباً ایک سیر) بلکہ آدھے مُد کے بھی برابر نہیں ہو سکتا۔"



-- ۳ --

ماہ محرم اور عاشورۂ محرم

عشرۂ محرم (محرم کے ابتدائی دس دن) میں شیعہ حضرات جس طرح مجالس عزا اور محافل ماتم برپا کرتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ سب اختراعی چیزیں ہیں اور شریعت اسلامیہ کے مزاج سے قطعاً مخالف۔ اسلام نے تو نوحہ و ماتم کے اس انداز کو "جاہلیت" سے تعبیر کیا ہے اور اس کام کو باعث لعنت بلکہ کفر تک پہنچا دینے والا بتلایا ہے۔

بدقسمتی سے اہل سنت میں سے ایک بدعت نواز حلقہ اگرچہ نوحہ و ماتم کا شیعی انداز تو اختیار نہیں کرتا لیکن ان دس دنوں میں بہت سی ایسی باتیں اختیار کرتا ہے جن سے رفض و تشیع کی ہمنوائی اور ان کے مذہب باطل کا فروغ ہوتا ہے۔ مثلاً:

- شیعوں کی طرح سانحۂ کربلا کو مبالغے اور رنگ آمیزی سے بیان کرنا۔
- حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور یزید رحمۃ اللہ علیہ کی بحث کے ضمن میں جلیل القدر صحابہ کرام (معاویہ اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما وغیرہ) کو ہدف طعن و ملامت بنانے میں بھی تامل نہ کرنا۔
- دس محرم کو تعزیے نکالنا' انہیں قابل تعظیم و پرستش سمجھنا' ان سے منتیں مانگنا' حلیم پکانا' پانی کی سبیلیں لگانا اپنے بچوں کو ہرے رنگ کے کپڑے پہنا کر انہیں حسین رضی اللہ عنہ کا فقیر بنانا۔
- دس محرم کو تعزیوں اور ماتم کے جلوسوں میں ذوق و شوق سے شرکت کرنا اور کھیل کود (گتکے اور پٹہ بازی) سے ان محفلوں کی رونق میں اضافہ کرنا' وغیرہ۔
- ماہ محرم کو سوگ کا مہینہ سمجھ کر اس مہینے میں شادیاں نہ کرنا۔
- ذوالجناح (گھوڑے) کے جلوس میں ثواب کا کام سمجھ کر شرکت کرنا۔

اور اسی انداز کی کئی چیزیں۔ حالانکہ یہ سب چیزیں بدعت ہیں جن سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق اجتناب ضروری ہے۔ آپ نے مسلمانوں کو تاکید کی ہے۔

«فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الأُمُوْرِ فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ

بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ» (مسند أحمد: ٤/١٢٦ـ١٢٧ وسنن أبي داود، السنة، ح:٤٦٠٧ وابن ماجه، اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين، ح:٤٢ وجامع الترمذي، العلم، ح:٢٦٧٦)

"مسلمانو! تم میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے ہی کو اختیار کرنا اور اسے مضبوطی سے تھامے رکھنا اور دین میں اضافہ شدہ چیزوں سے اپنے کو بچا کر رکھنا' اس لیے کہ دین میں نیا کام (چاہے وہ بظاہر کیسا ہی ہو) بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"

یہ بات ہر کہ ومہ پر واضح ہے کہ یہ سب چیزیں صدیوں بعد کی پیداوار ہیں' بنابریں ان کے بدعات ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور نبی ﷺ نے ہر بدعت کو گمراہی سے تعبیر فرمایا ہے جس سے مذکورہ خود ساختہ رسومات کی شناعت و قباحت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

محرم میں مسنون عمل

محرم میں مسنون عمل صرف روزے ہیں۔ حدیث میں رمضان کے علاوہ نفلی روزوں میں محرم کے روزوں کو سب سے افضل قرار دیا گیا ہے۔

«أَفْضَلُ الصِّيَامِ بَعْدَ رَمَضَانَ شَهْرُ اللهِ الْمُحَرَّمُ»(صحيح مسلم، الصيام، باب فضل صوم المحرم، ح:١١٦٣)

"رمضان کے بعد' سب سے افضل روزے' اللہ کے مہینے' محرم کے ہیں۔"

۱۰ محرم کے روزے کی فضیلت

بالخصوص دس محرم کے روزے کی حدیث میں یہ فضیلت آئی ہے کہ یہ ایک سال گذشتہ کا کفارہ ہے۔

(صحیح مسلم' باب استحباب صیام ثلاثة ایام ..... حدیث :۱۱۶۲)

اس روز آنحضرت ﷺ بھی خصوصی روزہ رکھتے تھے (ترغیب) پھر نبی ﷺ کے علم میں یہ بات آئی کہ یہودی بھی اس امر کی خوشی میں کہ دس محرم کے دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے نجات ملی تھی' روزہ رکھتے ہیں تو نبی ﷺ نے فرمایا کہ عاشورہ (دس محرم) کا روزہ تو ضرور رکھو لیکن یہودیوں کی مخالفت بھی بایں طور کرو کہ اس کے بعد یا اس سے قبل ایک روزہ اور ساتھ ملالیا کرو۔ ۹'۱۰ محرم یا '۱۰' ۱۱ محرم کا روزہ رکھا کرو۔

«صُوْمُوْا يَوْمَ عَاشُوْرَآءَ وَخَالِفُوا الْيَهُوْدَ صُوْمُوْا قَبْلَهُ يَوْمًا أَوْ بَعْدَهُ يَوْمًا»(مسند أحمد بتحقيق أحمد شاكر، ح:٢١٥٤ ومجمع الزوائد:٣/ ٤٣٤، مطبوعة دارالفكر، ١٤١٤هـ/ ١٩٩٤ء)

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے عاشورے کا روزہ رکھا اور مسلمانوں کو بھی اس دن کا روزہ رکھنے کا حکم فرمایا' تو صحابہ نے آپ کو بتلایا کہ یہ دن تو ایسا ہے جس کی تعظیم یہود و نصاریٰ بھی کرتے ہیں' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَئِنْ بَقِيْتُ إِلٰى قَابِلٍ لَأَصُوْمَنَّ التَّاسِعَةَ»(صحيح مسلم، الصيام، باب أي يوم يصام في عاشوراء، ح:١١٣٤)

"اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو نویں محرم کا روزہ (بھی) رکھوں گا۔"

لیکن اگلا محرم آنے سے قبل ہی آپ اللہ کو پیارے ہو گئے' ﷺ۔

ایک ضروری وضاحت

بعض علماء کہتے ہیں کہ "میں نویں محرم کا روزہ رکھوں گا" کا مطلب ہے کہ صرف محرم کی ۹ تاریخ کا روزہ رکھوں گا یعنی دس محرم کا روزہ نہیں' بلکہ اس کی جگہ ۹ محرم کا روزہ رکھوں گا۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اب صرف ۹ محرم کا ایک روزہ رکھنا مسنون عمل ہے۔ ۱۰ محرم کا روزہ رکھنا بھی صحیح نہیں اور ۱۰ محرم کے ساتھ ۹ محرم کا روزہ ملا کر رکھنا بھی سنت نہیں۔ بلکہ اب سنت صرف ۹ محرم کا ایک روزہ ہے۔ لیکن یہ رائے صحیح نہیں۔ نبی ﷺ کے فرمان کا مطلب ہے کہ میں ۱۰ محرم کے ساتھ ۹ محرم کا روزہ بھی رکھوں گا' اسی لیے ہم نے ترجمے میں --بھی-- کا اضافہ کیا ہے' کیونکہ ۱۰ محرم کا روزہ تو آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نجات پانے کی خوشی میں رکھا تھا' اس اعتبار سے ۱۰ محرم کے روزے کی مسنونیت تو مسلم ہے' لیکن یہودیوں کی مخالفت کے لیے آپ نے اس کے ساتھ ۹ محرم کا روزہ رکھنے کی خواہش کا اظہار فرمایا جس پر عمل کرنے کا موقع آپ کو نہیں ملا۔ بعض دیگر روایات سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے' اسی لیے صاحب مرعاۃ مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری' امام ابن قیم اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہم نے اسی مفہوم کو زیادہ صحیح اور راجح قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: مرعاۃ المفاتیح' ۳/۲۷۰' طبع قدیم)

توسیع طعام کی بابت

ایک من گھڑت روایت

محرم کی دسویں تاریخ کے بارے میں جو روایت بیان کی جاتی ہے کہ اس دن جو شخص اپنے اہل و عیال پر فراخی کرے گا' اللہ تعالیٰ سارا سال اس پر فراخی کرے گا' بالکل بے اصل ہے جس کی صراحت شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ محققین نے کی ہے۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔

"۱۰ محرم کو خاص کھانا پکانا' توسیع کرنا وغیرہ من جملہ ان بدعات و منکرات سے ہے۔ جو نہ رسول اللہ ﷺ کی سنت سے ثابت ہے نہ خلفائے راشدین سے' اور نہ ائمہ مسلمین میں سے کسی نے اس کو مستحب سمجھا ہے۔" (فتاویٰ ابن تیمیہ: ۲/ ۳۵۴)

اور امام احمد رحمہ اللہ کا یہ قول مذکورہ روایت کے متعلق امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ ((لَا اَصْلَ لَهٗ' فَلَمْ يَرَهٗ شَيْئًا)) (اس کی کوئی اصل نہیں' امام احمد رحمہ اللہ نے اس روایت کو کچھ نہیں سمجھا۔) (منہاج السنۃ' ۲/ ۲۴۸ اور فتاویٰ مذکور)

اسی طرح امام صاحب کی کتاب اقتضاء الصراط المستقیم میں اس کی صراحت موجود ہے۔ (ص: ۳۰۱' طبع مصر ۱۹۵۰ء)

اور امام محمد بن وضاح نے اپنی کتاب "اَلْبِدَعُ وَالنَّهْيُ عَنْهَا" میں امام یحییٰ بن یحییٰ (متوفی ۲۳۴ھ) سے نقل کیا ہے۔

"میں امام مالک رحمہ اللہ کے زمانے میں مدینہ منورہ اور امام لیث' ابن القاسم اور ابن وہب کے ایام میں مصر میں موجود تھا اور یہ دن (عاشورا) وہاں آیا تھا میں نے کسی سے اس کی توسیع رزق کا ذکر تک نہیں سنا۔ اگر ان کے ہاں کوئی ایسی روایت ہوتی تو باقی احادیث کی طرح اس کا بھی وہ ذکر کرتے۔" (کتاب مذکور ص ۴۵)

اس روایت کی پوری سندی تحقیق حضرت الاستاذ المحترم مولانا محمد عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ نے اپنے ایک مفصل مضمون میں کی ہے جو ''الاعتصام'' ۱۳ مارچ ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا۔ مَنْ شَآءَ فَلْيُرَاجِعْهُ۔

یہ تمام مذکورہ امور وہ ہیں جو اہل سنت کے عوام کرتے ہیں' شیعہ ان ایام میں جو کچھ کرتے ہیں' ان سے اس وقت بحث نہیں' اس وقت ہمارا روئے سخن اہل سنت کی طرف ہے کہ وہ بھی دین اسلام سے ناواقفیت' عام جہالت اور ایک برخود غلط فرقے کی دسیسہ کاریوں سے بے خبری کی بنا پر مذکورہ بالا رسومات بڑی پابندی اور اہتمام سے بجا لاتے ہیں حالانکہ یہ تمام چیزیں اسلام کے ابتدائی دور کے بہت بعد کی ایجاد ہیں جو کسی طرح بھی دین کا حصہ نہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان:

«مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ»(صحيح البخاري، الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود، ح:٢٦٩٧ وصحيح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة . . .، ح:١٧١٨)

''دین میں نو ایجاد کام مردود ہے۔''

کے مصداق ان سے اجتناب ضروری ہے۔



-- ۴ --

مذکورہ بدعات اور رسومات کی ہلاکت خیزیاں

دین میں اپنی طرف سے اضافے ہی کو بدعت کہا جاتا ہے۔ پھر یہ چیزیں صرف بدعت ہی نہیں ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ شرک و بت پرستی کے ضمن میں آ جاتی ہیں۔ کیونکہ:

اولاً: تعزیے میں روح حسین رضی اللہ عنہ کو موجود اور انہیں عالم الغیب سمجھا جاتا ہے' تب ہی تو تعزیوں کو قابل تعظیم سمجھتے اور ان سے مدد مانگتے ہیں حالانکہ کسی بزرگ کی روح کو حاضر و ناظر جاننا اور عالم الغیب سمجھنا شرک و کفر ہے' چنانچہ حنفی مذہب کی معتبر کتاب فتاوی بزازیہ میں لکھا ہے مَنْ قَالَ اَرْوَاحُ الْمَشَائِخِ حَاضِرَۃٌ تَعْلَمُ یُکَفَّرُ ''جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ بزرگوں کی روحیں ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں اور وہ علم رکھتی ہیں' وہ کافر ہے۔''

ثانیًا: تعزیہ پرست تعزیوں کے سامنے سرنیہوڑتے ہیں جو سجدے ہی کی ذیل میں آتا ہے اور کئی لوگ تو کھلم کھلا سجدے بجا لاتے ہیں اور غیر اللہ کو سجدہ کرنا' چاہے وہ تعبدی ہو یا تعظیمی' شرک صریح ہے۔ چنانچہ کتب فقہ حنفیہ میں بھی سجدہ لغیر اللہ کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ شمس الائمہ سرخسی کہتے ہیں:

«إِنْ كَانَ لِغَيْرِ اللهِ تَعَالٰى عَلٰى وَجْهِ التَّعْظِيْمِ كُفْرٌ»

''غیر اللہ کو تعظیمی طور (بھی) سجدہ کرنا کفر ہے۔''

اور علامہ قہستانی حنفی فرماتے ہیں یُکَفَّرُ والسجدۃ مُطْلَقًا یعنی غیر اللہ کو سجدہ کرنے والا مطلقاً کافر ہے چاہے عبادۃً ہو یا تعظیماً'' (ردالمحتار)

ثالثًا: تعزیہ پرست نوحہ خوانی و سینہ کوبی کرتے ہیں اور ماتم و نوحہ میں کلمات شرکیہ ادا کرتے ہیں' اول تو نوحہ خوانی بجائے خود غیر اسلامی فعل ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُيُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ» (صحيح البخاري، الجنائز، باب ليس منا من ضرب الخدود، ح: ١٢٩٧)

''وہ شخص ہم میں سے نہیں جس نے رخسار پیٹے گریبان چاک کیے اور زمانۂ جاہلیت کے سے بین کیے۔''

یہ صورتیں جو اس حدیث میں بیان کی گئی ہیں' نوحہ و ماتم کے ضمن میں آتی ہیں' جو ناجائز ہیں۔ اس لیے فطری اظہار غم کے علاوہ اظہار غم کی جو بھی مصنوعی اور غیر فطری صورتیں ہوں گی' وہ سب ناجائز نوحے میں شامل ہوں گی۔ پھر ان نوحوں میں مبالغہ کرنا اور زمین و آسمان کے قلابے ملانا اور عبد و معبود کے درمیان فرق کو مٹا دینا تو وہی جاہلانہ شرک ہے جس کے مٹانے کے لیے ہی تو اسلام آیا تھا۔

رابعًا: تعزیہ پرست تعزیوں سے اپنی مرادیں اور حاجات طلب کرتے ہیں جو صریحاً شرک ہے۔ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ میدان کربلا میں مظلومانہ شہید ہو گئے اور اپنے اہل و عیال کو ظالموں کے پنجے سے نہ بچا سکے تو اب بعد از وفات وہ کسی کے کیا کام آ سکتے ہیں؟

خامسًا: تعزیہ پرست حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مصنوعی قبر بناتے ہیں اور اس کی زیارت کو ثواب سمجھتے ہیں حالانکہ حدیث میں آتا ہے:

«مَنْ زَارَ قَبْرًا بِلاَ مَقْبُوْرٍ كَاَنَّمَا عَبَدَ الصَّنَمَ» (رساله تنبيه الضالين، از مولانا اولاد حسن، والد نواب صديق حسن خان رحمه الله تعالي)

یعنی ''جس نے ایسی خالی قبر کی زیارت کی جس میں کوئی میت نہیں تو گویا اس نے بت کی پوجا کی۔''

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی صراحت

علاوہ ازیں اہل سنت عوام کی اکثریت مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی عقیدت کیش ہے' لیکن تعجب ہے کہ اس کے باوجود وہ محرم کی ان خود ساختہ رسومات میں خوب ذوق و شوق سے حصہ لیتے ہیں۔ حالانکہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے بھی ان رسومات محرم سے منع کیا ہے اور انہیں بدعت' ناجائز اور حرام لکھا ہے اور ان کو دیکھنے سے بھی روکا ہے۔ چنانچہ ان

کا فتویٰ ہے۔

"تعزیہ آتا دیکھ کر اعراض وروگردانی کریں۔ اس کی طرف دیکھنا ہی نہیں چاہیے۔"

(عرفان شریعت' حصہ اوّل' صفحہ:۱۵)

ان کا ایک مستقل رسالہ "تعزیہ داری" ہے' اس کے صفحہ ۴ پر لکھتے ہیں:

- "غرض عشرۂ محرم الحرام کہ اگلی شریعتوں سے اس شریعت پاک تک نہایت بابرکت محل عبادت ٹھہرا تھا' ان بے ہودہ رسوم نے جاہلانہ اور فاسقانہ میلوں کا زمانہ کر دیا۔"
- "یہ کچھ اور اس کے ساتھ خیال وہ کچھ کہ گویا خود ساختہ تصویریں بعینہ حضرات شہداء رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جنازے ہیں۔"
- "کچھ اتارا باقی توڑا اور دفن کر دیے۔ یہ ہر سال اضاعت مال کے جرم میں دو وبال جداگانہ ہیں۔ اب تعزیہ داری اس طریقۂ نامرضیہ کا نام ہے۔ قطعاً بدعت و ناجائز حرام ہے۔"

صفحہ ۱۱ پر لکھتے ہیں:

- "تعزیہ پر چڑھایا ہوا کھانا نہ کھانا چاہیئے۔ اگر نیاز دے کر چڑھائیں' یا چڑھا کر نیاز دیں تو بھی اس کے کھانے سے احتراز کریں۔"

اور صفحہ ۱۵ پر حسب ذیل سوال' جواب ہے۔

سوال تعزیہ بنانا اور اس پر نذر و نیاز کرنا' عرائض بہ امید حاجت برآری لٹکانا اور بہ نیت بدعت حسنہ اس کو داخل حسنات جاننا کیسا گناہ ہے؟

جواب افعال مذکورہ جس طرح عوام زمانہ میں رائج ہیں' بدعت سیئہ و ممنوع و ناجائز ہیں۔

اسی طرح محرم کی دوسری بدعت مرثیہ خوانی کے متعلق "عرفان شریعت" کے حصہ اول صفحہ ۱۶ پر ایک سوال و جواب یہ ہے۔

سوال محرم شریف میں مرثیہ خوانی میں شرکت جائز ہے یا نہیں؟

جواب ناجائز ہے' وہ مناہی و منکرات سے پر ہوتے ہیں۔"

محرم کو سوگ کا مہینہ سمجھا جاتا ہے' اس لیے بالعموم ان ایام میں سیاہ یا سبز لباس پہنا جاتا

ہے اور شادی بیاہ سے اجتناب کیا جاتا ہے' اس کے متعلق مولانا احمد رضا خاں لکھتے ہیں
"محرم میں سیاہ' سبز کپڑے علامت سوگ ہے اور سوگ حرام۔" (احکام شریعت' ۷۱)

مسئلہ : کیا فرماتے ہیں مسائل ذیل میں؟

① بعض اہل سنت جماعت عشرۂ محرم میں نہ تو دن بھر روٹی پکاتے اور نہ جھاڑو دیتے ہیں' کہتے ہیں بعد دفن روٹی پکائی جائے گی۔

② ان دس دن میں کپڑے نہیں اتارتے۔ ③ ماہ محرم میں کوئی شادی بیاہ نہیں کرتے۔

الجواب: تینوں باتیں سوگ ہیں اور سوگ حرام ہے۔" (احکام شریعت حصہ اول ۷۱)

قرآن و حدیث کی ان تصریحات اور مولانا احمد رضا خان بریلوی کی توضیح کے بعد امید ہے کہ بریلوی علماء اپنے عوام کی صحیح رہنمائی فرمائیں گے اور عوام اپنی جہالت اور علماء کی خاموشی کی بنا پر جو مذکورہ بدعات و خرافات کا ارتکاب کرتے ہیں یا کم از کم ایسا کرنے والوں کے جلوسوں میں شرکت کر کے ان کے فروغ کا سبب بنتے ہیں' ان کو ان سے روکنے کی پوری کوشش کریں گے۔



وَمَا عَلَيْنَآ إِلَّا ٱلْبَلَٰغُ ٱلْمُبِينُ

❀ ❀ ❀

-- ۵ --

شیعی رسومات کی تاریخ ایجاد و آغاز

لعنت کا آغاز

"۳۵۱ھ میں معزالدولہ (احمد بن بُوَیہ دیلمی) نے جامع مسجد بغداد کے دروازے پر نعوذ باللہ "نقل کفر کفر نہ باشد" یہ عبارت لکھوا دی۔

«لَعَنَ اللهُ مُعَاوِيَةَ بْنَ أَبِيْ سُفْيَانَ وَمَنْ غَصَبَ فَاطِمَةَ فَدَكًا وَّمَنْ مَنَعَ مِنْ دَفْنِ الْحَسَنِ عِنْدَ جَدِّهٖ وَمَنْ نَفٰى أَبَاذَرٍّ وَّمَنْ اَخْرَجَ الْعَبَّاسَ عَنِ الشُّوْرٰى»

عید غدیر کی ایجاد

معزالدولہ نے ۱۸ ذوالحجہ ۳۵۱ھ کو بغداد میں عید منانے کا حکم دیا اور اس عید کا نام "عید خم غدیر" رکھا' خوب ڈھول بجائے گئے اور خوشیاں منائی گئیں۔ اسی تاریخ کو یعنی ۱۸ ذوالحجہ ۳۵ھ کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ شہید ہوئے تھے' لہٰذا اس روز شیعوں کے لیے "خم غدیر" کی عید منانے کا دن تجویز کیا گیا۔ احمد بن بویہ دیلمی یعنی معزالدولہ کی اس ایجاد کو جو ۳۵۱ھ میں ہوئی' شیعوں نے یہاں تک رواج دیا کہ آج کل کے شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ عید غدیر کا مرتبہ عیدالاضحی سے زیادہ بلند ہے۔

ماتم اور تعزیہ داری کی ایجاد

۳۵۲ھ کے شروع ہونے پر ابن بویہ مذکور نے حکم دیا کہ ۱۰ محرم کو حضرت "امام" حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے غم میں تمام دکانیں بند کر دی جائیں' بیع و شراء بالکل موقوف رہے' شہر و دیہات کے لوگ ماتمی لباس پہنیں اور علانیہ نوحہ کریں۔ عورتیں اپنے بال کھولے ہوئے' چہروں کو سیاہ کیے ہوئے' کپڑوں کو پھاڑتے ہوئے سڑکوں اور بازاروں میں مرثیے پڑھتی' منہ نوچتی اور چھاتیاں پیٹتی ہوئی' نکلیں۔ شیعوں نے اس حکم کی بخوشی تعمیل کی مگر اہلسنّت دم بخود اور خاموش رہے کیونکہ شیعوں کی حکومت تھی۔ آئندہ سال ۳۵۳ھ میں پھر اسی حکم کا اعادہ کیا

گیا اور سنیوں کو بھی اس کی تعمیل کا حکم دیا گیا۔ اہل سنت اس ذلت کو برداشت نہ کر سکے چنانچہ شیعہ اور سنیوں میں فساد برپا ہوا اور بہت بڑی خون ریزی ہوئی۔ اس کے بعد شیعوں نے ہر سال اس رسم کو زیر عمل لانا شروع کر دیا اور آج تک اس کا رواج ہندوستان میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان (متحدہ) میں اکثر سنی لوگ بھی تعزیے بناتے ہیں۔" ("تاریخ اسلام" اکبر خاں نجیب آبادی۔ ج:۲' ص:۵۲۶۔ طبع کراچی)

شیعیت کا فتنہ

"بنی بویہ نہایت متعصب شیعہ تھے' چند دنوں تک وہ خاموش رہے پھر ان کے تعصب کا ظہور ہونے لگا۔ دولت عباسیہ کے بہت سے وزراء اور متوسل عجمی اور شیعہ تھے لیکن ان میں سے کسی نے علانیہ شیعیت کی ترویج و اشاعت کی جرأت نہ کی تھی۔ معزالدولہ نے خلفاء کی قوت ختم کرنے کے ساتھ ہی بغداد میں شیعیت کی تبلیغ شروع کر دی اور ۳۵۱ھ میں جامع اعظم کے پھاٹک پر یہ تبرا لکھوایا۔

"معاویہ بن ابی سفیان' غاصبین فدک' "امام" حسن رضی اللہ عنہ کو روضہ نبوی ﷺ میں دفن کرنے سے روکنے والوں' حضرت ابوذر کو جلا وطن کرنے والوں' عباس کو شوری سے خارج کرنے والوں پر لعنت ہو۔" (تاریخ ابن اثیر' ج:۸' ص:۱۷۹)

خلیفہ میں اس بدعت کو روکنے کی طاقت نہ تھی' کسی سنی نے رات کو یہ عبارت مٹا دی' معزالدولہ نے پھر لکھوانے کا ارادہ کیا لیکن اس کے وزیر مہلبی نے مشورہ دیا کہ صرف معاویہ رضی اللہ عنہ کے نام کی تصریح کی جائے اور ان کے نام کے بعد وَالظّٰلِمِيْنَ لِآلِ مُحَمَّدٍ یعنی "آل محمد ﷺ پر ظلم کرنے والوں" کا فقرہ بڑھا دیا جائے۔ معزالدولہ نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ غالباً تبرا کی اس منافقانہ شکل کی ابتداء اسی سے ہوتی ہے۔

معزالدولہ نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ بغداد میں شیعوں کے تمام مراسم جاری کر دیے عید غدیر کے دن عام عید اور جشن مسرت منانے کا حکم دیا۔ محرم کے لیے حکم جاری کیا کہ عاشورے کے دن تمام دکانیں اور کاروبار بند رکھے جائیں' کل مسلمان خاص قسم کی ٹوپیاں پہن کر نوحہ و ماتم کریں۔ عورتیں چہرے پر بھبھوت مل کر پریشان مو گریبان چاک سینہ کوبی کرتی ہوئی شہر میں ماتمی جلوس نکالیں' سنیوں پر یہ احکام بہت شاق گذرے لیکن شیعوں کی

قوت اور حکومت کے سامنے بے بس تھے اس لیے ان احکام کو منسوخ تو نہ کرا سکے لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محرم ۳۵۳ھ میں شیعوں اور سنیوں میں سخت فساد ہوا۔ اور بغداد میں بڑی بدامنی پھیل گئی۔'' (ابن اثیر' ج:۸' ص:۱۸۴۔ تاریخ اسلام شاہ معین الدین احمد ندوی' اعظم گڈھ' ج:۴' ص:۱۲' ۱۳)



-- ۶ --

اہل سنت کے غور و فکر کیلیے چند باتیں

ماہ محرم کی ان بدعات و رسومات غیر شرعیہ کے علاوہ واقعۂ کربلا سے متعلق بھی اکثر اہل سنت کا زاویۂ فکر صحیح نہیں۔ اس سلسلے میں چند باتیں پیش خدمت ہیں' امید ہے کہ اہل سنت حلقے اس پر پوری سنجیدگی' متانت اور علم و بصیرت کی روشنی میں غور فرمائیں گے۔

کیا یہ معرکہ' حق و باطل کا تھا یا عام معمول کے مطابق ایک حادثہ؟

اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ اہل سنت کے خطباء اور وعاظ فلسفہ شہادت حسین رضی اللہ عنہ کو بالعموم اس طرح بیان کرتے ہیں جو خالصتاً شیعی انداز فکر اور رافضی آئیڈیالوجی کا مظہر ہوتا ہے اور اس کے متعلق یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہ تاریخ اسلام میں حق و باطل کا سب سے بڑا معرکہ تھا۔ یہ واعظین خوش بیان یہ نہیں سوچتے کہ اگر ایسا ہی ہوتا تو اس دور خیر القرون میں جب کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بھی ایک معتدبہ جماعت موجود تھی اور ان کے فیض یافتگان تابعین تو بکثرت تھے اس معرکے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ ہی اکیلے کیوں صف آراء ہوتے؟ معرکہ ہوتا حق و باطل اور کفر و اسلام کا اور صحابہ و تابعین اس سے نہ صرف یہ کہ الگ رہتے بلکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بھی اس سے روکتے' کیا ایسا ممکن تھا؟

شیعی آئیڈیالوجی تو یہی ہے کہ وہ (معاذاللہ) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کفر و ارتداد اور منافقت کے قائل ہیں اور وہ یہی کہیں گے کہ ہاں اس معرکۂ کفر و اسلام میں ایک طرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ تھے اور دوسری طرف صحابہ سمیت یزید اور دیگر ان کے تمام حمایتی' صحابہ و تابعین اس جنگ میں خاموش تماشائی بنے رہے اور حسین رضی اللہ عنہ نے اسلام کو بچانے کے لیے جان کی بازی لگا دی۔

لیکن کیا اہل سنت اس نقطۂ نظر کو تسلیم کر لیں گے؟

کیا صحابہ و تابعین کی اس بے غیرتی و بے حمیتی کی وہ تصدیق کریں گے جو شیعی انداز فکر کا منطقی نتیجہ ہے؟

کیا صحابہ نعوذ باللہ بے غیرت تھے؟ ان میں دینی حمیت اور دین کو بچانے کا جذبہ نہیں تھا؟

یقیناً کوئی اہل سنت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق اس قسم کا عقیدہ نہیں رکھتا' لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی بڑی تلخ ہے کہ اہل سنت شہادت حسین کا جو فلسفہ بیان کرتے ہیں وہ اسی تال سر سے ترتیب پاتا ہے جو شیعیت کا مخصوص راگ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ سانحۂ کربلا کو معرکہ حق و باطل باور کرانے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت کردار اور ان کی دینی حمیت مجروح ہوتی ہے اور شیعوں کا مقصد بھی یہی ہے لیکن یہ ہمارے سوچنے کی بات ہے کہ واقعہ ایسا ہے یا نہیں؟ تو حقیقت یہ ہے کہ یہ حق و باطل کا تصادم نہیں تھا' یہ کفرو اسلام کا معرکہ نہیں تھا' یہ اسلامی جہاد نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس راہ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اکیلے نہ ہوتے' ان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تعاون بھی انہیں حاصل ہوتا جن کی پوری عمریں اعلائے کلمۃ اللہ میں گزریں جو ہمہ وقت باطل کے لیے شمشیر برہنہ اور کفرو ارتداد کے لیے خدائی للکار تھے۔ یہ تصادم دراصل ایک سیاسی نوعیت کا تھا اس نکتے کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل پہلو قابل غور ہیں۔

◐ واقعات کربلا سے متعلقہ سب ہی تاریخوں میں ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب کوفے کی طرف کوچ کرنے کے لیے تیار ہو گئے تو ان کے رشتہ داروں اور ہمدردوں نے انہیں روکنے کی پوری کوشش کی اور اس اقدام کے خطرناک نتائج سے ان کو آگاہ کیا۔ ان میں حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت ابو سعید خدری' حضرت ابوالدرداء' حضرت ابوواقدلیثی' جابر بن عبداللہ' حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کے بھائی محمد بن الحنفیہ نمایاں ہیں۔ آپ نے ان کے جواب میں نہ عزم سفر ملتوی فرمایا نہ اپنے موقف کی کوئی دلیل پیش کی' ورنہ ممکن تھا کہ وہ بھی اس موقف میں ان کے ساتھ تعاون کے لیے آمادہ ہو

جاتے۔ دراصل حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اہل کوفہ ان کو مسلسل کوفہ آنے کی دعوت دے رہے ہیں' یقیناً وہاں جانا مفید ہی رہے گا۔

◐ یہ بھی تمام تاریخوں میں آتا ہے کہ ابھی آپ راستے ہی میں تھے کہ آپ کو خبر پہنچی کہ کوفے میں آپ کے چچیرے بھائی مسلم بن عقیل شہید کر دیے گئے جن کو آپ نے کوفے کے حالات معلوم کرنے کے لیے ہی بھیجا تھا۔ اس المناک خبر سے آپ کا اہل کوفہ پر سے اعتماد متزلزل ہو گیا اور واپسی کا عزم ظاہر کیا' لیکن حضرت مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے بھائیوں نے یہ کہہ کر واپس ہونے سے انکار کر دیا کہ ہم تو اپنے بھائی مسلم کا بدلہ لیں گے یا خود بھی مر جائیں گے اس پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا "تمہارے بغیر میں بھی جی کر کیا کروں گا؟"

«فَهَمَّ أَنْ يَّرْجِعَ وَكَانَ مَعَهُ إِخْوَةُ مُسْلِمِ بْنِ عَقِيْلٍ فَقَالُوْا وَاللهِ لاَ نَرْجِعُ حَتّٰى نُصِيْبَ بِثَأْرِنَا أَوْ نُقْتَلَ»(تاريخ الطبري: ٤/ ٢٩٢، مطبعة الاستقامة، قاهرة: ١٩٣٩ء)

"چنانچہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے واپسی کا ارادہ کر لیا' لیکن آپ کے ساتھ مسلم بن عقیل کے جو بھائی تھے' انہوں نے کہا کہ ہم تو اس وقت تک واپس نہیں جائیں گے جب تک کہ ہم انتقام نہ لے لیں یا پھر خود بھی قتل ہو جائیں۔"

اور یوں اس قافلے کا سفر کوفے کی طرف جاری رہا۔

◐ پھر اس پر بھی تمام تاریخیں متفق ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب مقام کربلا پر پہنچے تو گورنر کوفہ ابن زیاد نے عمر بن سعد کو مجبور کر کے آپ کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ عمر بن سعد نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے گفتگو کی تو متعدد تاریخی روائتوں کے مطابق حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی۔

«اِخْتَرْ مِنِّیْ اِحْدٰی ثَلاَثٍ إِمَّا أَنْ أَلْحَقَ بِثَغْرٍ مِّنَ الثُّغُوْرِ وَإِمَّا أَنْ أَرْجِعَ إِلَى الْمَدِيْنَةِ وَإِمَّا أَنْ أَضَعَ يَدِيْ فِيْ يَدِ يَزِيْدِ بْنِ مُعَاوِيَةَ فَقَبِلَ ذٰلِكَ عُمَرُ مِنْهُ»(الإصابة: ٢/ ٧١ الطبعة ١٩٩٥ء، دارالكتب العلمية)

یعنی "تین باتوں میں سے ایک بات مان لو۔ میں یا تو کسی اسلامی سرحد پر چلا جاتا ہوں یا

واپس مدینہ منورہ لوٹ جاتا ہوں یا پھر میں (براہ راست جاکر) یزید بن معاویہ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیتا ہوں (یعنی اس سے بیعت کر لیتا ہوں) عمر بن سعد نے ان کی یہ تجویز قبول کر لی۔"

ابن سعد نے خود منظور کر لینے کے بعد یہ تجویز ابن زیاد (گورنر کوفہ) کو لکھ کر بھیجی مگر اس نے اس تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ پہلے وہ (یزید کے لیے) میرے ہاتھ پر بیعت کریں۔

«فَكَتَبَ إِلَيْهِ عُبَيْدُاللهِ (ابْنُ زِيَادٍ) لاَ أَقْبَلُ مِنْهُ حَتّٰى يَضَعَ يَدَهُ فِي يَدِيْ» (الإصابة: ٢/ ٧١، الطبري: ٤/ ٢٩٣)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے اور ان کی طبع خود دار نے یہ گوارا نہیں کیا' چنانچہ اس شرط کو مسترد کر دیا جس پر لڑائی چھڑ گئی اور آپ کی مظلومانہ شہادت کا یہ حادثۂ فاجعہ پیش آ گیا۔

«فَإِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ - فَامْتَنَعَ الْحُسَيْنُ فَقَاتَلُوْهُ ... ثُمَّ كَانَ آخِرُ ذٰلِكَ أَنْ قُتِلَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَأَرْضَاهُ»

اس روایت کے مذکورہ الفاظ جس میں حضرت حسین نے بیعت یزید پر رضا مندی کا اظہار فرمایا "الاصابہ" کے علاوہ ٭ تہذیب التہذیب' ۳۲۸/۲-۳۵۳ ٭ تاریخ طبری' ۲۹۳/۴ ٭ تہذیب تاریخ ابن عساکر' ۳۲۵/۴-۳۳۷ ٭ البدایۃ والنہایۃ' ۱۷۰/۸-۱۷۵ ٭ کامل ابن اثیر' ۲۸۳/۳ اور دیگر کئی کتابوں میں موجود ہیں۔ حتی کہ شیعی کتابوں میں بھی ہیں۔ ان کے دوسرے الفاظ بھی ہیں تاہم نتیجے میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

ان تاریخی شواہد سے معلوم ہوا کہ اگر یہ حق و باطل کا معرکہ ہوتا تو کوفے کے قریب پہنچ کر جب آپ کو مسلم بن عقیل کی مظلومانہ شہادت کی خبر ملی تھی۔ آپ واپسی کا عزم ظاہر نہ فرماتے۔ ظاہر بات ہے کہ راہ حق میں کسی کی شہادت سے احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ ساقط نہیں ہو جاتا۔

پھر ان شرائط مصالحت سے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے عمر بن سعد کے سامنے رکھیں' یہ

بات بالکل نمایاں ہو جاتی ہے کہ آپ کے ذہن میں کچھ تحفظات تھے بھی تو آپ ان سے دست بردار ہو گئے تھے۔ بلکہ یزید کی حکومت تک کو تسلیم کر لینے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔

ایک یہ بات اس سے واضح ہوئی کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ' امیر یزید کو فاسق و فاجر یا حکومت کا نااہل نہیں سمجھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ کسی حالت میں بھی اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے کے لیے تیار نہ ہوتے جیسا کہ وہ تیار ہو گئے تھے' بلکہ یزید کے پاس جانے کے مطالبے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ان سے حسن سلوک ہی کی توقع تھی۔ ظالم و سفاک بادشاہ کے پاس جانے کی آرزو (آخری چارۂ کار کے طور پر بھی) کوئی نہیں کرتا۔

اس تفصیل سے اس حادثے کے ذمہ دار بھی عریاں ہو جاتے ہیں اور وہ ہے ابن زیاد کی فوج' جس میں سب وہی کوفی تھے جنھوں نے آپ کو خط لکھ کر بلایا تھا' انہی کوفیوں نے عمر بن سعد کی سعیٔ مصالحت کو بھی ناکام بنا دیا جس سے کربلا کا یہ المناک سانحۂ شہادت پیش آیا۔ وَكَانَ اَمْرُاللّٰهِ قَدَرًا مَقْدُوْرًا. (اس کی مزید تفصیل کتاب کے آخر میں --سانحۂ کربلا' پس منظر اور اسباب-- میں ملاحظہ فرمائیں۔)

حضرت عثمان اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی شہادت

جب واقعہ یہ ہے کہ یہ معرکہ سیاسی نوعیت کا حامل ہے' حق و باطل کا معرکہ نہیں ہے' تو بہتر ہے کہ ایام محرم میں اس موضوع ہی سے احتراز کیا جائے کہ ان دنوں میں اس سانحے کو اپنے بیان و خطابت کا موضوع بنانا بھی شیعیت کو فروغ دینا ہے کیونکہ تاریخ اسلام میں اس سے بھی زیادہ اہم تر شہادتوں کو نظرانداز کر کے سانحۂ کربلا کو اجاگر کرنا یہ بھی رفض و تشیع ہی کا انداز ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کچھ کم جگر سوز اور دل دوز ہے جو ۱۸ ذوالحجہ کو ہوئی؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادتِ عظمیٰ کیا معمولی سانحہ ہے جو یکم محرم کو پیش آیا؟ اسی طرح اور بڑی بڑی شہادتیں ہیں لیکن ان سب کو نظرانداز کر کے صرف شہادت حسین رضی اللہ عنہ کو اپنی زبان و قلم کا موضوع بنانا کسی طرح صحیح نہیں' اور جو شخص ایسا کرتا ہے وہ بالواسطہ اور شعوری یا غیر شعوری طور پر شیعی انداز فکر کو فروغ دینے کا باعث بنتا ہے۔

"امام" اور "علیہ السلام"

اسی طرح اہل سنت کی اکثریت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلا سوچے سمجھے "امام حسین علیہ السلام" بولتی ہے حالانکہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ "امام" کا لفظ بولنا اور اسی طرح "رضی اللہ عنہ" کے بجائے "علیہ السلام" کہنا بھی شیعیت ہے۔ ہم تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ عزت و احترام کے لیے "حضرت" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق' حضرت عمر' حضرت عثمان' حضرت علی رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ ہم کبھی "امام ابوبکر صدیق' امام عمر" نہیں بولتے۔ اسی طرح ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی کے بعد "رضی اللہ عنہ" لکھتے اور بولتے ہیں۔ اور کبھی "ابوبکر صدیق علیہ السلام یا حضرت عمر علیہ السلام" نہیں بولتے' لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ "رضی اللہ عنہ" کے بجائے "علیہ السلام" بولتے ہیں۔ کبھی اس پر بھی غور کیا کہ ایسا کیوں ہے؟ دراصل یہ شیعیت کا وہ اثر ہے جو غیر شعوری طور پر ہمارے اندر داخل ہو گیا ہے اس لیے یاد رکھیے کہ چونکہ شیعوں کا ایک بنیادی مسئلہ "امامت" کا بھی ہے اور امام ان کے نزدیک انبیاء کی طرح من جانب اللہ نامزد اور معصوم ہوتا ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی ان کے بارہ اماموں میں سے ایک امام ہیں' اس لیے ان کے لیے "امام" کا لفظ بولتے ہیں اور اسی طرح ان کے لیے "علیہ السلام" لکھتے اور بولتے ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ ایک صحابیٔ رسول ہیں "امام معصوم" نہیں نہ ہم شیعوں کی امامت معصومہ کے قائل ہی ہیں۔ اس لیے ہمیں انہیں دیگر صحابۂ کرام کی طرح "حضرت حسین رضی اللہ عنہ" لکھنا اور بولنا چاہیئے۔ "امام حسین علیہ السلام" نہیں۔ کیونکہ یہ شیعوں کے معلوم عقائد اور مخصوص تکنیک کے غماز ہیں۔

یزید پر سب و شتم کا مسئلہ

اسی طرح ایک مسئلہ یزید رحمۃ اللہ علیہ پر سب و شتم کا ہے جسے بدقسمتی سے رواج عام حاصل ہو گیا ہے اور بڑے بڑے علامہ فہامہ بھی یزید کا نام برے الفاظ سے لیتے ہیں' بلکہ اس پر لعنت کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں سمجھتے اور اس کو "حب حسین" اور "حب اہل بیت" کا لازمی تقاضا سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بھی اہل سنت کے مزاج اور مسلک سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے محققین علمائے اہل

سنت نے یزید پر سب و شتم کرنے سے بھی روکا ہے اور اسی ضمن میں اس امر کی صراحت بھی کی ہے کہ یزید کا قتل حسین میں نہ کوئی ہاتھ ہے نہ اس نے کوئی حکم دیا اور نہ اس میں اس کی رضا مندی ہی شامل تھی۔ ہم یہاں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال کے بجائے امام غزالی کی تصریحات نقل کرتے ہیں جن سے عام اہل سنت بھی عقیدت رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں امام ابن تیمیہ کا موقف کتاب کے آخر میں وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں:

«مَا صَحَّ قَتْلُهُ لِلْحُسَيْنِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَلاَ اَمْرُهُ وَلاَ رِضَاهُ بِذٰلِكَ وَمَهْمَا لَمْ يَصِحَّ ذٰلِكَ عَنْهُ لَمْ يَجُزْ أَنْ يُّظَنَّ ذٰلِكَ فَإِنَّ إِسَآءَةَ الظَّنِّ أَيْضًا بِالْمُسْلِمِ حَرَامٌ قَالَ اللهُ تَعَالٰى ﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱجْتَنِبُوا۟ كَثِيرًا مِّنَ ٱلظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ ٱلظَّنِّ إِثْمٌ . . . ﴾ فَهٰذَا الأَمْرُ لاَ يُعْلَمُ حَقِيْقَتُهُ أَصْلاً وَّإِذَا لَمْ يُعْرَفْ وَجَبَ إِحْسَانُ الظَّنِّ بِكُلِّ مُسْلِمٍ يُّمْكِنُ إِحْسَانُ الظَّنِّ بِهِ»(وفيات الاعيان: ٢/ ٤٥٠، طبع جديد)

یعنی ''حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یزید کا قتل کرنا یا ان کے قتل کرنے کا حکم دینا یا ان کے قتل پر راضی ہونا' تینوں باتیں درست نہیں اور جب یہ باتیں یزید کے متعلق ثابت ہی نہیں تو پھر یہ بھی جائز نہیں کہ اس کے متعلق ایسی بدگمانی رکھی جائے کیونکہ کسی مسلمان کے متعلق بدگمانی حرام ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے' بنابریں ہر مسلمان سے حسن ظن رکھنے کے وجوب کا اطلاق یزید سے حسن ظن رکھنے پر بھی ہوتا ہے۔''

اسی طرح اپنی معروف کتاب احیاء العلوم میں فرماتے ہیں:

«فَإِنْ قِيْلَ هَلْ يَجُوْزُ لَعْنُ يَزِيْدَ بِكَوْنِهِ قَاتِلَ الْحُسَيْنِ أَوْ آمِرًا بِهِ قُلْنَا هٰذَا لَمْ يَثْبُتْ أَصْلاً وَّلاَ يَجُوْزُ أَنْ يُّقَالَ إِنَّهُ قَتَلَهُ أَوْ أَمَرَ بِهِ مَا لَمْ يَثْبُتْ» (٣/ ١٣١)

یعنی ''اگر سوال کیا جائے کہ کیا یزید پر لعنت کرنی جائز ہے کیونکہ وہ (حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا) قاتل ہے یا قتل کا حکم دینے والا ہے؟ تو ہم جواب میں کہیں گے کہ یہ باتیں قطعاً

ثابت نہیں ہیں اور جب تک یہ باتیں ثابت نہ ہوں اس کے متعلق یہ کہنا جائز نہیں کہ اس نے قتل کیا یا قتل کا حکم دیا۔"

پھر مذکورۃ الصدر مقام پر اپنے فتوے کو آپ نے ان الفاظ پر ختم کیا ہے:

«وَأَمَّا التَّرَحُّمُ عَلَيْهِ فَجَائِزٌ بَلْ مُسْتَحَبٌّ بَلْ هُوَ دَاخِلٌ فِيْ قَوْلِنَا فِيْ كُلِّ صَلٰوةٍ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ فَإِنَّهُ كَانَ مُؤْمِنًا ـ وَاللهُ أَعْلَمُ»(وفيات الأعيان: ٢/ ٤٥٠، طبع جديد)

یعنی "یزید کے لیے رحمت کی دعا کرنا (رحمۃ اللہ علیہ کہنا) نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے اور وہ اس دعا میں داخل ہے جو ہم کہا کرتے ہیں۔ (یا اللہ! مومن مردوں اور مومن عورتوں سب کو بخش دے) اس لیے کہ یزید مومن تھا!۔ واللہ اعلم۔"

مولانا احمد رضا خاں کی صراحت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی، جو تکفیر مسلم میں نہایت بے باک مانے جاتے ہیں، یزید رحمہ اللہ کے بارے میں یہ وضاحت فرمانے کے بعد کہ امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ اسے کافر جانتے ہیں اور امام غزالی وغیرہ مسلمان کہتے ہیں، اپنا مسلک یہ بیان کرتے ہیں کہ:

"اور ہمارے امام سکوت فرماتے ہیں کہ ہم نہ مسلمان کہیں نہ کافر، لہٰذا یہاں بھی سکوت کریں گے---" (احکام شریعت، ص:۸۸، حصہ دوم)

فسق و فجور کے افسانے؟ رہی بات یزید رحمہ اللہ کے فسق و فجور کے افسانوں کی، تو یہ بھی یکسر غلط ہے جس کی تردید کے لیے خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے برادر اکبر محمد بن الحنفیہ کا یہ بیان ہی کافی ہے جو انہوں نے اس کے متعلق اسی قسم کے افسانے سن کر دیا تھا۔

«مَا رَأَيْتُ مِنْهُ مَا تَذْكُرُوْنَ وَقَدْ حَضَرْتُهُ وَأَقَمْتُ عِنْدَهُ فَرَأَيْتُهُ مُوَاظِبًا عَلَى الصَّلٰوةِ مُتَحَرِّيًا لِّلْخَيْرِ يَسْأَلُ عَنِ الْفِقْهِ مُلَازِمًا لِّلسُّنَّةِ»

(البداية والنهاية: ٨/ ٢٣٦، دارالديان للتراث، الطبعة ١٩٨٨ء)

یعنی "تم ان کے متعلق جو کچھ کہتے ہو میں نے ان میں ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی، میں

نے ان کے ہاں قیام کیا ہے اور میں نے انہیں پکا نمازی، خیر کا متلاشی، مسائل شریعت سے لگاؤ رکھنے والا اور سنت کا پابند پایا ہے۔ (البداية والنهاية، ج:۸ ص:۲۳۳)

غزوۂ قسطنطنیہ کے شرکاء کی مغفرت کیلئے بشارت نبوی

علاوہ ازیں کم از کم ہم اہل سنت کو اس حدیث کے مطابق ہی یزید کو برا بھلا کہنے سے باز رہنا چاہیئے جس میں رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ قسطنطنیہ میں شرکت کرنے والوں کے متعلق مغفرت کی بشارت دی ہے اور یزید اس جنگ کا کمانڈر تھا۔ یہ بخاری کی صحیح حدیث ہے اور آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے، کسی کاہن یا نجومی کی پیشین گوئی نہیں کہ بعد کے واقعات اسے غلط ثابت کر دیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر نبی کے فرمان اور کاہن کی پیشین گوئی میں فرق باقی نہ رہے گا۔ کیا ہم اس حدیث کی مضحکہ خیز تاویلیں کر کے یہی کچھ ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ یہ حدیث مع ترجمہ درج ذیل ہے:

«أَوَّلُ جَيْشٍ مِّنْ أُمَّتِي يَغْزُوْنَ مَدِيْنَةَ قَيْصَرَ مَغْفُوْرٌ لَّهُمْ»

(صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب ما قيل في قتال الروم، ح:۲۹۲٤)

”میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) میں جہاد کرے گا، وہ بخشا ہوا ہے۔“



-- ۷ --

سوالات اور ان کے جوابات

مذکورہ مضمون کی "الاعتصام" میں اشاعت کے بعد ایک بریلوی ماہنامہ "رضائے مصطفیٰ" گوجرانوالہ کے مدیر نے اس پر آٹھ سوالات لکھ کر راقم کو بھیجے، جن کا جواب بھی انہی دنوں "الاعتصام" کے چار شماروں میں شائع کر دیا گیا تھا۔ افادۂ عام کی غرض سے یہ سوالات و جوابات بھی ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

سوال : ① واقعۂ کربلا میں حق و صحیح موقف کس کا تھا اور ناحق و غلط کس کا۔ یزید کا یا امام حسین رضی اللہ عنہ کا؟

جواب : ① موقف حسین و یزید افسوس ہے کہ مدیر مذکور نے یہ سوال کر کے وہ روایت دہرا دی ہے جو مشہور ہے کہ ساری رات یوسف و زلیخا کا قصہ سننے کے بعد دن کو کسی نے پوچھا کہ زلیخا مرد تھی یا عورت؟ حالانکہ راقم نے اپنے مذکورہ مضمون میں سب سے پہلے اسی نکتے پر بحث کی ہے کہ اس معرکے کو جو حق و باطل اور کفر و اسلام کا معرکہ باور کرایا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کو فی الواقع حق و باطل کا معرکہ تسلیم کر لینے سے اہل سنت کے بنیادی عقیدے (صحابہ کرام کی عظمت و رفعت اور ان کی بے مثال دینی حمیت و عصبیت) پر سخت ضرب پڑتی ہے۔

اس کے بعد بتلایا تھا کہ یہ معرکہ اگر حق و باطل کا نہ تھا تو اس کی نوعیت کیا تھی؟ اور خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے طرز عمل سے اس بات کی وضاحت کی تھی کہ انہوں نے مسلم بن عقیل کی شہادت کی خبر پا کر واپس لوٹ جانے کا جو ارادہ ظاہر فرمایا اور پھر کوفہ پہنچنے کے بعد وہاں سے واپس جانے کی جو صورتیں پیش فرمائیں۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ سابقہ موقف سے، جو بھی ان کے ذہن میں تھا، رجوع فرما لیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ معرکہ حق و باطل کا ہوتا تو وہ ہرگز اس سے رجوع نہ فرماتے۔

دراصل موصوف یہ سوال کر کے کہ صحیح موقف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا تھا یا یزید کا؟ ایک عام جذباتی فضا سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ عام ذہن یہ بنا دیا گیا ہے کہ یزید بہت برا شخص تھا' خانوادۂ رسول کا دشمن تھا اور دنیا جہان کی خرابیاں اس میں جمع تھیں۔ اس فضا میں کون شخص حقیقت سے پردہ اٹھانے کی ہمت کر سکتا ہے؟ اور اگر کوئی شخص یہ جرأت کر لے تو ایسے شخص کے متعلق فوراً یہ کہہ دیا جا سکتا ہے کہ یہ تو ''اہل بیت'' کا دشمن ہے۔ دیکھو تو کتنی جرأت سے حادثۂ کربلا کی تحقیق کے درپے ہے۔

تاہم چند باتیں اہل علم و فکر کے غور کے لیے پیش خدمت ہیں۔

یزید کے موقف کی وضاحت تاریخ میں موجود ہے اور وہ یہ کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد اس وقت کی ساری قلمرو میں وہ حضرت معاویہ کے صحیح جانشین قرار دیے گئے' صرف مدینہ منورہ میں چار صحابیوں سے بیعت لینی باقی تھی [1] حضرت عبداللہ بن عمر [2] حضرت عبداللہ بن عباس [3] حضرت عبداللہ بن زبیر [4] اور حضرت حسین۔۔ رضی اللہ عنہم ۔۔

اوّل الذکر دونوں بزرگوں نے یزید کی حکومت باقاعدہ طور پر منظور کر لی جیسا کہ تاریخ طبری وغیرہ' سب تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے جب کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے پہلوتہی کی جس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں سے کہا۔

«اِتَّقِيَا اللهَ وَلاَ تفرَّقَا بَيْنَ جَمَاعَةِ الْمُسْلِمِيْنَ»
(البداية والنهاية: ٨/ ١٥٠، الطبري: ٤/ ٢٥٤)

یعنی ''اللہ سے ڈرو اور مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ نہ ڈالو۔''

اور واقعہ یہ ہے کہ جن محققین علمائے امت نے حقائق کی روشنی میں جذبات سے الگ ہو کر اس پر غور کیا ہے وہ یزید کی حکومت کو اسی طرح درست تسلیم کرتے رہے جس طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور دیگر سارے شہروں کے سب صحابہ و تابعین نے' صرف مذکور الصدر دو صحابیوں کے سوا' یزید کو وقت کا امیر المومنین تسلیم کر لیا تھا۔ چنانچہ ٦٠٠ھ میں وفات پانے والے ایک بڑے عابد و زاہد اور اونچے پائے کے محدث و فقیہ حافظ عبدالغنی بن عبدالواحد مقدسی رحمہ اللہ سے جب یزید کے بارے میں سوال ہوا تو انہوں نے

جواب دیا۔

«خِلاَفَتُهُ صَحِيْحَةٌ قَالَ بَعْضُ الْعُلَمَآءِ بَايَعَهُ سِتُّوْنَ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ مِنْهُمُ ابْنُ عُمَرَ وَأَمَّا مَحَبَّتُهُ فَمَنْ أَحَبَّهُ فَلاَ يُنْكَرُ عَلَيْهِ وَمَنْ لَّمْ يُحِبَّهُ فَلاَ يَلْزَمُهُ ذٰلِكَ لاَنَّهُ لَيْسَ مِنَ الصَّحَابَةِ الَّذِيْنَ صَحِبُوْا رَسُوْلَ اللهِ ﷺ فَيَلْتَزِمُ مَحَبَّتُهُمْ إِكْرَامًا لِصُحْبَتِهِمْ»(ذيل طبقات الحنابلة لابن رجب رحمة الله عليه: ٢/ ٣٤)

یعنی ''یزید کی خلافت صحیح تھی چنانچہ بعض علماء کا کہنا ہے کہ ساٹھ صحابہ رضی اللہ عنہم نے بشمول حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس کی بیعت کرلی تھی۔ رہی اس سے محبت رکھنے کی بات تو اگر اس سے کوئی محبت رکھتا ہے تو اس پر نکیر نہیں کرنی چاہیئے تاہم کوئی اس سے محبت نہ رکھے جب بھی کوئی ایسی بات نہیں' وہ صحابی تو نہیں جس سے محبت رکھنا شرعاً ضروری ہو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تک نے یزید کی بیعت کرلی تھی تو ظاہر ہے یزید کا موقف یہی ہو سکتا تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہو کر اس کی حکومت کو صحیح جانیں تاکہ انتشار کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

رہا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا موقف؟ تو حقیقت یہ ہے کہ بعد کی حاشیہ آرائیوں اور فلسفہ طرازیوں سے صرف نظر کر کے اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے واضح الفاظ میں اپنے موقف کی کبھی وضاحت ہی نہیں فرمائی کہ وہ کیا چاہتے تھے؟ اور ان کے ذہن میں کیا تجویز تھی؟ یزید کے خلیفہ بن جانے کے بعد جب گورنر مدینہ ولید بن عتبہ نے انہیں یزید کی بیعت کرنے کی دعوت دی تو انہوں نے فرمایا کہ میں خفیہ بیعت نہیں کر سکتا' اجتماع عام میں بیعت کروں گا۔

«أَمَّا مَا سَأَلْتَنِي مِنَ الْبَيْعَةِ فَإِنَّ مِثْلِيْ لاَ يُعْطِيْ بَيْعَتَهُ سِرًّا وَّلاَ أَرَاكَ تَجْتَزِىءُ بِهَا مِنِّيْ سِرًّا دُوْنَ أَنْ نُظْهِرَهَا عَلٰى رُؤُوْسِ النَّاسِ عَلاَنِيَةً»(الطبري: ٤/ ٢٥١، مطبوعه دارالاستقامة)

گورنر نے انہیں مزید مہلت دے دی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ یہ مہلت پاکر مدینہ سے مکہ تشریف لے گئے۔ مکہ پہنچ کر بھی انہوں نے کوئی وضاحت نہیں کی' البتہ وہاں سے کوفہ جانے کی تیاریاں شروع کر دیں جس کی خبر پاکر ہمدرد و بہی خواہ' جن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ متعدد صحابی بھی تھے' انہیں کوفہ جانے سے روکتے رہے لیکن وہ کوفہ جانے پر ہی مصر رہے۔ حتیٰ کہ ایک موقعے پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قریبی رشتہ دار عبداللہ بن جعفر گورنر مکہ عمرو بن سعید کے پاس آئے اور ان سے استدعا کی کہ آپ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے نام ایک چھٹی لکھ دیں جس میں واضح الفاظ میں انہیں امان دیے جانے اور ان سے حسن سلوک کرنے کا ذکر ہو تاکہ حسین رضی اللہ عنہ واپس آ جائیں اور کوفہ نہ جائیں۔ گورنر مکہ نے کہا کہ آپ جو چاہیں لکھ کر لے آئیں میں اس پر اپنی مہر لگا دوں گا۔ چنانچہ وہ اپنے الفاظ میں ایک امان نامہ لکھ لائے جس پر گورنر مکہ نے اپنی مہر لگا دی۔ عبداللہ بن جعفر نے پھر درخواست کی کہ یہ چٹھی بھی آپ خود اپنے ہی بھائی کے ہاتھ حضرت حسین رضی اللہ عنہ تک پہنچائیں تاکہ حسین پوری طرح مطمئن ہو جائیں کہ ساری جدوجہد گورنر مکہ کی طرف سے ہو رہی ہے۔ گورنر مکہ نے ان کی یہ بات بھی قبول کر لی اور اپنے بھائی کو بھی عبداللہ بن جعفر کے ساتھ روانہ کر دیا۔ یہ دونوں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو جا کر ملے لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے معذرت کر دی اور کوفہ جانے پر ہی اصرار کیا اور یہاں بھی اپنے موقف کی وضاحت نہیں کی بلکہ صاف لفظوں میں کہا کہ میں کوفہ جس مقصد کے لیے جا رہا ہوں وہ صرف مجھے معلوم ہے اور وہ میں بیان نہیں کروں گا۔ (الطبری ۲۹۱/۴-۲۹۲)

خود شیعہ مورخ ابن طقطقی بھی لکھتا ہے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ مکہ سے کوفہ روانہ ہوئے تو انہیں مسلم کے حال کا کوئی علم نہیں تھا۔ جب کوفے کے قریب پہنچ گئے تو انہیں مسلم کے قتل کا علم ہوا۔ وہاں انہیں لوگ ملے اور انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ جانے سے روکا اور انہیں ڈرایا لیکن حسین رضی اللہ عنہ واپس ہونے پر آمادہ نہیں ہوئے اور کوفہ جانے کا عزم جاری رکھا۔ ایک ایسے مقصد کے لیے جسے وہ خود ہی جانتے تھے۔

«فَلَمْ يَرْجِعْ وَصَمَّمَ عَلَى الْوُصُوْلِ إِلَى الْكُوْفَةِ لِأَمْرٍ هُوَ أَعْلَمُ بِهِ

مِنَ النَّاسِ»(الفخري ص:٨٥، طبع مصر ١٩٢٧ء)

شاید ایسے ہی مبہم طرز عمل کی وجہ سے یزید کے غالی حمایتیوں نے حضرت حسین کو جب اس حدیث کا مصداق قرار دینے کی کوشش کی۔

«فمَنْ أَرَادَ أَنْ يُفَرِّقَ أَمْرَ هٰذِهِ الأُمَّةِ وَهِيَ جَمِيْعٌ فَاضْرِبُوْهُ بَالسَّيْفِ كَائِنًا مَّنْ كَانَ»

(صحيح مسلم، الإمارة، باب حكم من فرق أمر المسلمين وهو مجتمع، ح:١٨٥٢)

تو حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس کی سخت تردید کرتے ہوئے فرمایا:

«وَأَهْلُ السُّنَّةِ يَرُدُّوْنَ غُلُوَّ هٰؤُلآءِ وَيَقُوْلُوْنَ إِنَّ الْحُسَيْنَ قُتِلَ مَظْلُوْمًا شَهِيْدًا وَّالَّذِيْنَ قَتَلُوْهُ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ»(منهاج السنة: ٢/٢٥٦)

"اہل سنت والجماعت اس غلو کو مسترد کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ حسین رضی اللہ عنہ کو ظلماً شہید کیا گیا' اور ان کے قاتل ظالم تھے۔"

پھر لکھا: "اس لیے وہ حدیث مذکور کا مصداق نہیں ہو سکتے کہ آپ رضی اللہ عنہ (آخراً) جماعت مسلمین سے الگ نہیں رہے وہ مسلمانوں کی اجتماعیت میں شامل تھے اور وہ یوں کہ انہوں نے (کوفی فوج سے) صاف فرمایا تھا کہ (تم لوگ) مجھے واپس اپنے شہر لوٹ جانے دو یا سرحد کی کسی چوکی پر چلے جانے دو یا (پھر) یہ کہ میں یزید کے پاس براہ راست چلا جاتا ہوں۔" (منہاج السنۃ' ٢/٢٥٦)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر الزام مذکور کی تردید میں "منہاج السنہ" کے ایک دوسرے مقام میں ہے:

«اَلْحُسَيْنُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ لَمْ يُقْتَلْ إِلاَّ مَظْلُوْمًا شَهِيْدًا تَارِكًا لِطَلَبِ الإِمَارَةِ طَالِبًا لِلرُّجُوْعِ إِمَّا إِلٰى بَلْدَةٍ أَوْ إِلَى الثَّغْرِ أَوْ إِلَى الْمُتَوَلِّيْ عَلَى النَّاسِ يَزِيْدَ»(منهاج السنة: ٢/٢٤٣)

یزید کے پاس جانے سے حضرت رضی اللہ عنہ کی غرض کیا تھی؟ تاریخی روایتوں نے یہ بھی بتادیا ہے۔

چنانچہ تاریخ کی ایک متداول کتاب تاریخ الخلفاء میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

«فَلَمَّا رَهِقَهُ السِّلَاحُ عَرَضَ عَلَيْهِمُ الاِسْتِسْلَامَ وَالرُّجُوْعَ وَالْمَضِيَّ إِلٰى يَزِيْدَ فَيَضَعُ يَدَهُ فِيْ يَدِهِ»(تاریخ الخلفاء، ص:۱۳۸ طبع مصر)

"جب کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا تو حضرت حسین نے انہیں صلح کی، واپسی کی اور یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کے لیے یزید کے پاس جانے کی پیش کش کی۔"

اس قسم کے الفاظ اصابہ (حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ)، تہذیب ابن عساکر، تاریخ طبری اور البدایہ والنہایہ وغیرہ تاریخ و تراجم کی کتابوں میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

اس بحث سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حق اور صحیح موقف کس کا تھا؟

یزید کے طلب بیعت کے صحیح ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ گویا نعوذ باللہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل ناروا کا اقدام بھی صحیح تھا۔ اس کا اہل سنت میں سے کوئی قائل نہیں نہ ہم ہی اس کو درست سمجھتے ہیں اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیۓ کہ یہاں موقف کی بحث میں مراد ہے وہ موقف جو یزید کی طرف سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے مطالبۂ بیعت سے متعلق ہے۔

البتہ رہی یہ بات کہ یزید مطالبۂ بیعت میں حق بجانب تھا یا نہیں؟ تو یہ خود مدیر موصوف غور فرمالیں جب کہ یزید کو ساری اسلامی قلمرو میں بشمول صحابۂ کرام واجب الاطاعت حاکم تسلیم کرلیا گیا تھا۔

سوال: ② واقعۂ کربلا سے قبل باختلاف روایات، یزید جو کچھ بھی تھا مگر واقعۂ کربلا و واقعۂ حرہ کے بعد بھی کیا وہ ظالم و قاتل اور فاسق و فاجر قرار نہیں پاتا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ کیا اتنے عظیم ظالمانہ واقعات کا یزید پر کوئی بوجھ نہیں؟ یہ واقعات اس کا کارنامہ ہیں یا سیاہ نامہ؟

جواب: ② واقعہ حرہ کی حقیقت سانحہ کربلا ۶۱ھ میں رونما ہوا۔ اس وقت صحابۂ کرام کی بھی ایک معقول تعداد موجود تھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خاندان بھی تھا بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اپنی اولاد ہی ڈھائی درجن سے زیادہ تھی۔ اسی

طرح دیگر قرابت مند بھی تھے' لیکن جہاں تک سانحہ کربلا کا تعلق ہے اس پر ساری قلمرو میں کوئی عمومی رد عمل ظاہر نہیں ہوا نہ اس حادثۂ الیمہ کے باعث یزید کو "ظالم و قاتل اور فاسق و فاجر" قرار دے کر اس کے خلاف کسی نے بھی خروج کو جائز سمجھا' گو ذاتی قلق اس کا کیسا بھی شدید رہا ہو۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ ان دونوں کے سوا باقی سب لوگوں نے یزید کی حکومت یا (خلافت) کو درست تسلیم کر لیا تھا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ مکہ میں قیام پذیر تھے اور شاید سمجھ رہے تھے کہ ان کے لیے میدان اب صاف ہے چنانچہ وہ حکومت حاصل کرنے کے لیے کارروائیوں میں مصروف تھے ۶۳ھ میں حسب تحریر حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اہل مدینہ میں سے متعدد حضرات کی جن میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم بھی تھے ہمدردیاں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھیں۔ انہی دنوں ایک وفد مرتب ہوا۔ جو "یزید" کے ہاں گیا۔ یزید نے ان کی خوب آؤ بھگت کی لیکن اس وفد نے مدینہ منورہ واپس آکر یزید کے عیوب گنوانے شروع کر دیے اور اس کی طرف شراب نوشی وغیرہ باتیں منسوب کر کے ان کو عوام میں خوب پھیلایا گیا۔

«فَرَجَعُوْا فَأَظْهَرُوْا عَيْبَهُ وَنَسَبُوْهُ إِلٰى شُرْبِ الْخَمْرِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ»
(فتح الباري: ۸۸/۱۳، ح: ۷۱۱۱، طبع دارالسلام)

جس کے نتیجے میں اہل مدینہ نے نہ صرف یہ کہ یزید کی بیعت سے الگ ہونے کا اعلان کر دیا۔

«لَمَّا انْتَزَى أَهْلُ الْمَدِيْنَةِ مَعَ عَبْدِاللهِ بْنِ الزُّبَيْرِ خَلَعُوْا يَزِيْدَ بْنَ مُعَاوِيَةَ»(فتح الباري: ۸۸/۱۳ ح: ۷۱۱۱، طبع دارالسلام)

بلکہ گورنر مدینہ عثمان بن محمد پر دھاوا بول دیا اور خاندان بنی امیہ کو محاصرے میں لے لیا۔ (تاریخ طبری' ۳۷۰/۴ طبع مطبعة الاستقامة)

لیکن اہل مدینہ کے اس طرز عمل کو اہل خیر و صلاح نے بالکل پسند نہیں کیا اور اس سے برملا اظہار بیزاری فرمایا جیسا کہ جلیل القدر صحابی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق صحیح بخاری

میں آتا ہے کہ جب ان کو اہل مدینہ کے طرز عمل کی اطلاع پہنچی تو انہوں نے اپنے اہل خانہ یعنی بال بچوں کو جمع کیا اور ان سے فرمایا:

«إِنِّيْ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ يُنْصَبُ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَإِنَّا قَدْ بَايَعْنَا هٰذَا الرَّجُلَ عَلٰى بَيْعِ اللهِ وَرَسُوْلِهِ وَإِنِّيْ لاَ أَعْلَمُ غَدْرًا أَعْظَمَ مِنْ أَنْ يُّبَايَعَ رَجُلٌ عَلٰى بَيْعِ اللهِ وَرَسُوْلِهِ ثُمَّ يُنْصَبُ لَهُ الْقِتَالُ وَإِنِّيْ لاَ أَعْلَمُ أَحَدًا مِّنْكُمْ خَلَعَهُ وَلاَ تَابَعَ فِيْ هٰذَا إِلاَّ كَانَتِ الْفَيْصَلُ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُ»(صحيح البخاري، الفتن، باب إذا قال عند قوم شيئا. . .، ح: ٧١١١)

یعنی ''میں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کے دن ہر بد عہدی (غدر) کرنے والے کے لیے ایک جھنڈا (علامتی نشان) نصب کر دیا جائے گا۔ ہم نے اس شخص (یزید) سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بیعت کی ہے' میری نظر میں اس سے زیادہ بد عہدی اور کوئی نہیں کہ ایک شخص کی اللہ اور اس کے رسول کے نام پر بیعت کی جائے پھر آدمی اسی کے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔ یاد رکھو تم میں سے کسی کے متعلق بھی اگر مجھے یہ معلوم ہوا کہ اس نے یزید کی بیعت توڑ دی ہے۔ یا وہ بد عہدی کرنے والوں کے پیچھے لگ گیا ہے تو میرے اور اس کے درمیان کوئی تعلق نہ رہے گا۔''

اسی طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یزید کی بیعت توڑنے سے گریز کیا۔ (البدایہ والنہایہ' ۸/۲۱۸) بلکہ خاندان حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر اہل بیت نبوی کے کسی فرد نے بھی اس موقعے پر نہ بیعت توڑی نہ اس شورش میں کسی قسم کا حصہ لیا۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

«كَانَ عَبْدُاللهِ بْنُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ وَجَمَاعَاتُ أَهْلِ بَيْتِ النُّبُوَّةِ مِمَّنْ لَّمْ يَنْقُضِ الْعَهْدَ وَلاَ بَايَعَ أَحَدًا بَعْدَ بَيْعَتِهِ لِيَزِيْدَ . . . لَمْ يَخْرُجْ أَحَدٌ مِّنْ آلِ أَبِيْ طَالِبٍ وَّلاَ مِنْ بَنِيْ عَبْدِالْمُطَّلِبِ أَيَّامَ الْحَرَّةِ»(البداية والنهاية، ص: ٨/ ٢٣٥)

یعنی "عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور اہل بیت نبوی کے کسی گروہ نے نقض عہد نہیں کیا' نہ یزید کی بیعت کے بعد کسی اور کی بیعت کی۔ آل ابو طالب (حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خاندان) اور اولاد عبدالمطلب میں سے کسی نے بھی ایام حرہ میں (یزید کے خلاف) خروج نہیں کیا۔"

محمد بن الحنفیہ کی طرف سے یزید کی صفائی

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بھائی محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان لوگوں کے سامنے' جن کے ہاتھ میں "شورش" کی قیادت تھی' یزید کی بیعت توڑ دینے اور اس کے خلاف کسی اقدام میں شرکت کرنے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ یزید پر لگائے گئے الزامات کو بے بنیاد قرار دیا اور یزید کی صفائی پیش کی۔ اس موقعے پر انہوں نے جو تاریخی بیان دیا' وہ حسب ذیل ہے۔
حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

"عبداللہ بن مطیع اور ان کے رفقائے کار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے' محمد بن الحنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گئے اور انہیں یزید کی بیعت توڑ دینے پر رضا مند کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس پر ابن مطیع نے کہا "یزید شراب نوشی' ترک نماز اور کتاب اللہ کے حکم سے تجاوز کرتا ہے" محمد بن الحنفیہ نے کہا "تم جن باتوں کا ذکر کرتے ہو میں نے ان میں سے کوئی چیز اس میں نہیں دیکھی۔ میں اس کے پاس گیا ہوں' میرا وہاں قیام بھی رہا۔ میں نے اس کو ہمیشہ نماز کا پابند' خیر کا متلاشی' علم دین کا طالب اور سنت کا ہمیشہ پاسدار پایا" وہ کہنے لگے' وہ یہ سب کچھ محض تصنع اور آپ کے دکھلاوے کے لیے کرتا ہو گا۔ ابن الحنفیہ نے جواب میں کہا "مجھ سے اسے کون سا خوف یا لالچ تھا۔ جس کی بنا پر اس نے میرے سامنے ایسا کیا؟ تم جو اس کی شراب نوشی کا ذکر کرتے ہو' کیا تم میں سے کسی نے خود اسے ایسا کرتے دیکھا ہے؟ اگر تمہارے سامنے اس نے ایسا کیا ہے تو تم بھی اس کے ساتھ اس کام میں شریک رہے ہو' اور اگر ایسا نہیں ہے تو تم اس چیز کے متعلق کیا گواہی دے سکتے ہو جس کا تمہیں علم ہی نہیں' وہ کہنے لگے "یہ بات ہمارے نزدیک سچ ہے اگرچہ ہم میں سے کسی نے اسے ایسا کرتے نہیں دیکھا" ابن الحنفیہ

رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "اللہ تو اس بات کو تسلیم نہیں کرتا' وہ تو فرماتا ہے اِلَّا مَنْ شَھِدَ بِالْحَقِّ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ "گواہی انہی لوگوں کی معتبر ہے جن کو اس بات کا ذاتی علم ہو" جاؤ! میں کسی بات میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا" وہ کہنے لگے "شاید آپ کو یہ بات ناگوار گزرتی ہو کہ یہ معاملہ آپ کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ میں رہے۔ اگر ایسا ہے تو قیادت ہم آپ کے سپرد کیے دیتے ہیں" برادر حسین رضی اللہ عنہ نے کہا" تم جس چیز پر قتال وجدال کر رہے ہو' میں سرے سے اس کو جائز ہی نہیں سمجھتا' مجھے کسی کے پیچھے لگنے یا لوگوں کو اپنے پیچھے لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" وہ کہنے لگے آپ اس سے پہلے اپنے والد کے ساتھ مل کر جو جنگ کر چکے ہیں" انہوں نے فرمایا "تم پہلے میرے باپ جیسا آدمی اور انہوں نے جن سے جنگ کی ان جیسے افراد تو لا کر دکھاؤ۔ اس کے بعد میں بھی تمہارے ساتھ مل کر جنگ کر لوں گا" وہ کہنے لگے' آپ اپنے صاحبزادگان ابوالقاسم اور قاسم ہی کو ہمارے حوالے کر دیں' انہوں نے فرمایا: میں ان کو اگر اس طرح کا حکم دوں تو میں خود نہ تمہارے ساتھ اس کام میں شریک ہو جاؤں؟ وہ کہنے لگے' اچھا آپ صرف ہمارے ساتھ چل کر لوگوں کو آمادۂ قتال کر دیں انہوں نے فرمایا "سبحان اللہ! جس کو میں خود ناپسند کرتا ہوں اور اس سے مجتنب ہوں۔ لوگوں کو اس کا حکم کیسے دوں؟ اگر میں ایسا کروں تو میں اللہ کے معاملے میں اس کے بندوں کا خیر خواہ نہیں' بدخواہ ہوں گا۔" وہ کہنے لگے "ہم پھر آپ کو مجبور کریں گے" انہوں نے کہا "میں اس وقت بھی لوگوں سے یہی کہوں گا کہ اللہ سے ڈرو اور مخلوق کی رضا کی خاطر خالق کو ناراض نہ کرو" (البدایة والنہایة ۲۳۶/۸)

مگر ان مساعیٔ خیر و صلاح کے علی الرغم شورش نے انتہائی نازک صورت اختیار کر لی۔ یزید کو خبر پہنچی تو شورش کو فرو کرنے کے لیے فوج بھیج دی اور اس کو ہدایت کی کہ شورش کرنے والوں کو تین دن کی مہلت دینا' اگر اس دوران میں وہ اپنا طرز عمل درست کر لیں تو ٹھیک ہے ورنہ پھر تمہیں کارروائی کی اجازت ہے فوج نے اپنے خلیفہ کے حکم کے مطابق عمل کیا لیکن اہل مدینہ نے اس مہلت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ جنگ کرنے کے لیے مقابلے پر آ گئے۔

اس مناسب مقام تفصیل سے واقعہ حرہ کی بنیادی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے نیز یہ کہ اس "شورش" کو اہل خیر و صلاح نے کس نظر سے دیکھا تھا؟ تاہم ان ایام حرہ میں' مبالغہ آمیز تفصیلات سے قطع نظر' جو غیر مستند ہی ہیں کیونکہ ان کا راوی ابو مخنف ہی ہے جو کذاب اور شیعہ ہے' یزید کی فوج نے حد سے تجاوز کر کے جو کاروائیاں کی ہیں۔ ان پر علماء نکیر ہی کرتے آئے ہیں' انہیں مستحسن کسی نے بھی نہیں کہا ہے۔

واقعہ کربلا کی بھی جو حقیقت ہے اس پر ہم مختصراً روشنی ڈال آئے ہیں۔ اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی تصریحات سے ہم اپنے سابقہ مضمون میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ اس سلسلے میں یزید کو مطعون کرنا درست نہیں کیونکہ نہ اس نے ایسا کیا نہ ایسا کرنے کا حکم دیا۔ نہ اس کو پسند کیا۔

اگر کسی درجے میں سانحہ کربلا اور واقعہ حرہ کا ذمہ دار یزید ہی کو ٹھہرا لیا جائے اور اس بنا پر اس کو "فاسق و فاجر اور قاتل و ظالم" بھی سمجھ لیا جائے تب بھی یہ تمام جرائم کبائر ہی شمار ہوں گے۔ اور کبائر کے ارتکاب سے کوئی مسلمان نہ دائرہ اسلام سے خارج ہوتا ہے نہ رحمت و مغفرت خداوندی کے امکان سے محروم۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کے تمام گناہ معاف کر سکتا ہے جیسا کہ اس نے کہا ہے کہ شرک کے علاوہ چاہوں گا تو دوسرے گناہ معاف کر دوں گا۔

﴿ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِۦ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَآءُ ﴾(النساء ٤/ ٤٨)

پھر یزید کی مغفرت کے لیے تو بالخصوص بشارت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم بھی موجود ہے اور آیت قرآنی اور حدیث نبوی کے علاوہ اہل سنت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفر و شرک کے علاوہ ہر گناہ معاف کر سکتا ہے۔

«وَمَا كَانَ مِنَ السَّيِّئَاتِ دُوْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ وَلَمْ يَتُبْ عَنْهَا صَاحِبُهَا حَتَّى مَاتَ مُؤْمِنًا فَإِنَّهُ فِيْ مَشِيْئَةِ اللهِ إِنْ شَآءَ عَذَّبَهُ وَإِنْ شَآءَ عَفَا عَنْهُ وَلَمْ يُعَذِّبْهُ بِالنَّارِ أَصْلاً»

یعنی "شرک و کفر کے علاوہ چاہے جو بھی گناہ آدمی سے سرزد ہوئے ہوں اور ان سے

اس نے توبہ بھی نہ کی ہو ہاں مرتے دم تک مومن رہا (کافر نہ ہوا) تو اس کا معاملہ اللہ کی مرضی پر ہے چاہے وہ عذاب دے' چاہے وہ بالکل معاف کر دے اور نار جہنم کی اس کو ہوا تک نہ لگنے دے۔"

اوّل تو اس بات کا ہی کوئی شخص ثبوت پیش نہیں کر سکتا کہ یزید نے ان جرائم پر اپنی زندگی میں توبہ نہیں کی' اور بغیر توبہ کیے ہی مر گیا۔ بلکہ ۹۹ فیصد اسی بات کا امکان ہے کہ اس نے یقیناً توبہ کی ہو گی۔ آخر وہ مسلمان اور نماز روزے کا پابند تھا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ بغیر توبہ ہی مراتب بھی جب تک اس کے کفرو ارتداد کا ثبوت مہیا نہیں کر دیا جاتا' اس کو امکان مغفرت سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ دیکھ لیجیے! اہل سنت کا عقیدہ یہی ہے کہ کفرو شرک کے علاوہ جو بھی گناہ ہو اور اس کا مرتکب چاہے بغیر توبہ کیے ہی مر گیا ہو تب بھی اس کا معاملہ اللہ کی مشیت پر ہے چاہے عذاب دے چاہے بخش دے۔

مدیر موصوف اس کو "ظالم اور فاسق و فاجر" تسلیم کرا کے معلوم نہیں کیا چاہتے ہیں؟ اور ان کے ذہن میں کیا ہے؟ اس کو انہوں نے کھولا نہیں۔ اگر اس سے مقصد ان کا یہ ہے کہ ایسے شخص کی مغفرت ممکن نہیں تو ہم موصوف سے دلائل شرعی کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر صرف اس کا ظلم تسلیم کرانا مطلوب ہے تو اسے تسلیم کر لینے سے وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو جاتا ہے۔ وہ کتنا بھی گناہ گار اور "ظالم و فاسق" ہو وہ بہرحال مسلمان تھا اور عین ممکن ہے کہ مرنے سے پہلے وہ تائب بھی ہو گیا ہو۔ نہ بھی تائب ہوا تو امکان مغفرت بہرحال اس کے حق میں موجود ہے۔

اور اگر مدیر موصوف کا مطلب اس سے یہ ہے کہ ایسے شخص کے لیے دعائے رحمت و مغفرت نہیں کرنی چاہیئے تو یہ بات بھی صحیح نہیں' دعا تو ہوتی ہی گناہ گاروں کے لیے ہے اگر ہم کسی گناہ گار مسلمان کے لیے دعا نہ بھی کریں گے تب بھی ہماری عام دعاؤں میں وہ ضرور شامل ہو جائے گا۔ جب ہم کہیں گے۔

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ»

"اے اللہ تمام مومن و مسلمان مردوں اور عورتوں کو بخش دے۔"

تو اس میں ہر مومن از خود شامل ہو جاتا ہے۔ چاہے کیسا ہی گناہ گار ہو۔ بہر حال واقعاتِ کربلا و حرہ کو یزید کا کارنامہ کوئی نہیں کہتا۔ البتہ اس کی مبالغہ آمیز تفصیلات سے ضرور انکار ہے جس کا زیادہ تر راوی ابو مخنف لوط بن یحییٰ ہے جو کذاب اور غالی شیعہ تھا (میزان) اور بھیانک روایتیں اسی کی ہیں اور جس حد تک یہ واقعات صحیح ہیں ان میں اگر فی الواقع یزید ملوث ہے تو اس کے "سیاہ کارنامے" شمار ہوں گے لیکن ان غلطیوں سے چاہے وہ کتنی بھی عظیم ہوں وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوتا ہے نہ مغفرت خداوندی کے امکان سے محروم۔

سوال : ③ اگر یزید کا قتل اہل بیت میں کوئی ہاتھ نہیں اور یہ سب کچھ ابن زیاد و ابن سعد کی کارستانی ہے تو کیا یزید کا یہ فرض نہیں تھا کہ وہ بحکم ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ)) (صحيح بخاری، النكاح، باب المرأة راعية في بيت زوجها، حديث :5200) اپنے گورنر سپہ سالار وغیرہ کا مؤاخذہ کرتا اور انہیں قتل اہل بیت کی سزا دیتا اور نہیں تو کیا قتل اہل بیت کے جرم میں وہ ابن زیاد بد نہاد کو معزول بھی نہیں کر سکتا تھا؟"

جواب یہ سوال بجا ہے' یزید کو فی الواقع حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے مؤاخذہ کرنا اور انہیں ان کے عہدوں سے برطرف کر دینا چاہیئے تھا۔ لیکن جس طرح ہر حکمران کی کچھ سیاسی مجبوریاں ہوتی ہیں جن کی بنا پر بعض دفعہ انہیں اپنے ماتحت حکام کی بعض ایسی کارروائیوں سے بھی چشم پوشی کرنی پڑ جاتی ہے جنہیں وہ صریحاً غلط سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کچھ ایسی سیاسی مجبوری ہو جس کو یزید نے زیادہ اہمیت دے دی ہو گو اسے قتل حسین کو زیادہ اہمیت دینی چاہیئے تھی۔ اسے بھی آپ اس کی ایک اور بہت بڑی غلطی شمار کر سکتے ہیں اور بس۔ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھ لیجیے کہ ان کی خلافت کے مصالح نے انہیں نہ صرف قاتلین حضرت عثمان سے چشم پوشی پر مجبور کر دیا بلکہ انہیں بڑے بڑے اہم عہدے بھی تفویض کرنے پڑے۔ حالانکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کا سانحہ بھی کچھ کم المناک اور یہ جرم بھی کچھ کم عظیم جرم نہ تھا لیکن اس کے باوجود حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے خلاف کچھ نہ کر سکے۔ یزید نے تو قاتلین حسین رضی اللہ عنہ کو ان کے عہدوں سے صرف برطرف ہی نہیں کیا لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تو قتل عثمان کے بعد قاتلوں کو بڑے بڑے عہدوں

سے نوازا۔

یہ موازنہ اگرچہ ہمارے لیے سخت اذیت ناک ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ "اہلسنّت" جب عہد صحابہ رضی اللہ عنہ کو بھی بالکل شیعی نقطۂ نظر سے دیکھنا شروع کر دیں تو پھر اس کے بغیر چارہ بھی نہیں' اللہ تعالیٰ ہماری ان جسارتوں کو معاف فرمائے۔

سوال : ④ جب مسلم بن عقیل کی کوفے میں آمد کی خبر یزید کو پہنچ گئی اور اس نے ابن زیاد کو گورنر مقرر کر دیا تو کیا "امام" حسین رضی اللہ عنہ کی آمد اور اس کے گورنر و اہل کوفہ کے برتاؤ کی شہادت حسین رضی اللہ عنہ تک یزید کو کوئی اطلاع نہیں پہنچی تھی؟ حالانکہ اس نئی صورت حال کے متعلق یزید کی مسلسل دلچسپی و توجہ ایک فطرتی امر ہے اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ قتل اہل بیت میں یزید کافی الواقع ہاتھ ہے بلکہ یزید کا ابن زیاد کو گورنر مقرر کرنا اور اسے یہ کہنا کہ "کوفہ جاکر مسلم بن عقیل کی تلاش کر کے قتل تک سے دریغ نہ کرے" کیا یہ تمام حقائق یزید پلید کی اہل بیت اور قتل اہل بیت میں رضامندی کا ثبوت نہیں؟

جواب قیاس آرائی' ظن و تخمین اور اٹکل پچو سے حقائق کا اثبات ممکن نہیں۔ جہاں تک مسلم بن عقیل کی کوفے میں آمد کی اطلاع اور ابن زیاد کے گورنر مقرر کرنے کا تعلق ہے تو اس کے متعلق عرض ہے کہ کتب تواریخ میں موجود ہے کہ اس بارے میں یزید کے بعض حامیوں نے یزید کو اطلاع بھجوائی تھی کہ کوفے میں اس طرح کے حالات رونما ہو رہے ہیں اور یزید کو اس امر کی بھی انہوں نے اطلاع دی تھی کہ موجودہ گورنر کا طرز عمل نرم ہے۔ نیز وہ سختی کرنے پر آمادہ بھی نہیں جس سے شورش پر قابو پایا جا سکے۔ یہ اطلاع ملنے پر ہی یزید نے سابق گورنر کا تبادلہ کر کے ابن زیاد کو کوفہ و بصرہ کا گورنر مقرر کیا اور اسے سختی سے شورش کو دبانے کا اسی طرح حکم دیا جس طرح ہر فرمانروا کسی صوبے میں بدامنی و شورش کی اطلاع پا کر حکم دیا کرتا اور حکام کا عزل و نصب کرتا ہے۔ اگر آپ اسی طرح تاریخی روایات سے اس امر کا ثبوت بہم پہنچادیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی کسی نے یزید کو اس طرح کی اطلاع بھجوائی تھی اور وہ اطلاع پا کر یزید نے ابن زیاد کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ سختی کرنے کا حکم دیا تب تو یزید کی اہل بیت دشمنی اور قتل "اہل بیت" میں

"رضامندی" کی بات قابل قبول ہو سکتی ہے۔ موجودہ صورت میں تو یہ ہوائی باتیں ہیں جن سے اہل دانش کے نزدیک یزید پر کوئی الزام ثابت نہیں ہوتا اسی لیے تو امام غزالی جیسے ائمہ نے بھی اس بات کی صراحت کی ہے۔

«مَا صَحَّ قَتْلُهُ لِلْحُسَيْنِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَلاَ أَمْرُهُ وَلاَ رِضَاهُ بِذٰلِكَ»

(وفيات الأعيان: ٢/ ٤٥٠)

یعنی "یزید کے بارے میں یہ کہنا کہ اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا یا اس کے قتل کا حکم دیا' یا ان کے قتل پر رضامند تھا۔ ان میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں۔"

اور احیاء العلوم میں فرماتے ہیں:

«وَلاَ يَجُوْزُ أَنْ يُقَالَ إِنَّهُ قَتَلَهُ أَوْ أَمَرَ بِهِ مَا لَمْ يَثْبُتْ»(٣/ ١٣١)

"بغیر ثبوت کے یہ کہنا جائز ہی نہیں کہ یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کیا یا قتل کرنے کا حکم دیا۔"

اگر ایک بشارت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کا مصداق ہونے کے باوجود آپ یزید کا قافیہ "پلید" ہی سے ملانے پر مصر ہیں تو آپ کی مرضی۔ ہم کسی کی زبان و قلم پر پہرے نہیں بٹھا سکتے۔ تاہم اتنا ضرور عرض کریں گے کہ حدیث رسول کے مقابلے میں اس طرح کے ذہنی تحفظ کا مظاہرہ ایک مسلمان کے شایان شان نہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ بعض اکابر علماء نے بھی یزید کے لیے یہ لفظ استعمال کیا ہے لیکن انہوں نے عدم تحقیق کی بنا پر روا روی میں ایسا کیا ہے اور اس معاملے کی گہرائی میں وہ نہیں گئے اور بعض دفعہ ایسا ہو جاتا ہے کہ بعض مسائل میں جس طرح عام رائے ہوتی ہے بڑے بڑے محقق بھی انہیں تسلیم کر لیتے ہیں۔ لیکن جب کوئی دیدہ ور اس کی تہ میں اتر کر نقاب کشائی کرتا ہے تو صورت معاملہ بالکل مختلف نکلتی ہے اس لیے اس دور میں جب یزید کا کردار نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا گیا اور اس پر عام بحث ہوئی تو بہت سے مخفی گوشے بے نقاب ہو گئے۔ اب اگر کوئی شخص یزید کو "پلید" لکھنے پر اصرار کرتا ہے تو اسے بعض پچھلے علماء کی طرح معذور سمجھنا مشکل ہے ہاں اگر آپ کے نہاں خانۂ دماغ میں (ذاتی و سطحی باتوں کے علاوہ) اسے "پلید" یا "ملعون" لکھنے کے

معقول دلائل ہیں تو ان سے مطلع فرمائیں۔

سوال : ⑤ "یزید کے آلہ کار ابن زیاد' شمر' وغیرہم کس حد تک مجرم ہیں اور آپ کے نزدیک ان کا کیا حکم ہے؟"

جواب یہ لوگ یزید کے آلہ کار نہیں' اہلکار تھے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام سے جو ناخوشگوار صورت حال پیدا ہو گئی تھی اس سے اپنی صوابدید کے مطابق انہوں نے عہدہ برآہونے کی کوشش کی۔ یہ کوشش مذموم تھی یا مستحسن؟ اس میں رائے دہی خَرْطُ الْقَتَاد والی بات ہے۔ ایک تو تاریخ کی متضاد روائتوں نے واقعات کو بہت الجھا دیا ہے۔ دوسرے اس "سیاسی" نوعیت کے واقعے کو "مذہبی" رنگ دے دیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس پر کھل کر گفتگو کرنا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف ہو گیا ہے۔

ہم تاریخی تضاد کے انبار سے اگر حقیقت کی چہرہ کشائی کریں تو یہ راستہ طویل بھی ہو گا اور پھر بھی شائد آپ کے لیے ناقابل قبول۔ کیونکہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تاریخی روایات کا ایک پہلو ہے جب کہ روایات کا دوسرا پہلو اس کے برعکس ہے۔ اس لیے ہم مختصراً صرف واقعے کی روشنی میں اتنا ہی عرض کریں گے کہ آپ جذبات اور مذہبیت سے الگ ہو کر معاملے کو واقعاتی سطح سے دیکھیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اہل کوفہ کی دعوت پر بیعت خلافت لینے کے لیے تشریف لائے تھے وہ جنگ کرنے کے لیے نہیں آئے تھے' کیونکہ ۶۰-۷۰' افراد کے ساتھ جو بیشتر اہل خانہ ہی تھے جنگ نہیں ہوا کرتی۔ اہل کوفہ نے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ لیکن کیا حاکم وقت کے اہل کار بھی اپنے اس حاکم سے بغاوت کر ڈالتے جس پر تمام مسلمان متفق ہو چکے تھے۔ ایسا چونکہ ممکن نہیں تھا۔ تاہم حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے خیر سگالی کی گفتگو کی گئی جس کا خاطر خواہ اثر بھی ہونے لگا تھا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے تو اپنے موقف سے رجوع کر کے تین شرائط بھی پیش کر دی تھیں جن میں ایک شرط یزید کے پاس بھیج دینے کی بھی تھی لیکن انہی کوفیوں کی شرارت کہہ لیجئے جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خطوط لکھ کر بلوایا تھا یا ابن زیاد وغیرہ کی سختی کہ معاملہ سلجھتے سلجھتے الجھ گیا اور بات حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت تک جا پہنچی۔

اب اس وقت ایسا کوئی پیمانہ نہیں جس سے ناپ کر یا تول کر ابن زیاد اور عمر بن سعد کی غلطی کا اندازہ کر کے کوئی حکم لگایا جا سکے اگر حضرت حسین سے حسن سلوک میں انہوں نے کوئی کوتاہی کی ہے تو وہ یقیناً مجرم ہیں۔ تاہم یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ عمل اور رد عمل کے بنیادی نکتے کو نظر انداز کر کے بات بالعموم خاندانی شرف و فضل کے اعتبار سے کی جاتی ہے جو اصولاً غلط اور تحقیقی نقطۂ نظر کے منافی ہے۔

سوال : ⑥ **ایک طرف لفظ امام سے انکار اور صرف حضرت حسین** رضی اللہ عنہ **پر اصرار اور دوسری طرف ابن تیمیہ کو نہ صرف امام بلکہ "شیخ الاسلام ابن تیمیہ" تحریر کرنا ابن تیمیہ کی "امام" حسین** رضی اللہ عنہ **کے مقابلے میں کونسی فوقیت اور دلیل شرعی پر مبنی ہے؟"**

جواب افسوس ہے کہ اس سلسلے میں مدیر موصوف نے ہماری گزارشات کو غور سے نہیں پڑھا' اگر وہ ایسا کر لیتے تو ان کے قلم سے اس سطحیت کا اظہار نہ ہوتا جو ان کے سوال سے عیاں ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ پہلے ہم اپنی وہ وضاحت نقل کر دیں جس پر یہ سوال وارد کیا گیا ہے ہم نے لکھا تھا۔

"اہل سنت کی اکثریت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلا سوچے سمجھے "امام حسین علیہ السلام" بولتی ہے۔ حالانکہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ "امام" کا لفظ بولنا اور اسی طرح " رضی اللہ عنہ " کے بجائے " علیہ السلام " کہنا بھی شیعیت ہے۔ ہم تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ عزت و احترام کے لیے "حضرت" کا لفظ استعمال کرتے ہیں حضرت ابوبکر صدیق' حضرت عمر' حضرت عثمان' حضرت علی' وغیرہ۔ ہم کبھی "امام ابوبکر صدیق' امام عمر" نہیں بولتے۔ اسی طرح ہم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی کے بعد " رضی اللہ عنہ " لکھتے ہیں اور بولتے ہیں۔ اور کبھی "ابوبکر علیہ السلام " یا "حضرت عمر علیہ السلام " نہیں بولتے لیکن حضرت حسین " رضی اللہ عنہ " کے بجائے " علیہ السلام " بولتے ہیں۔ کبھی اس پر غور کیا ایسا کیوں ہے؟ دراصل یہ شیعیت کا وہ اثر ہے جو غیر شعوری طور پر ہمارے اندر داخل ہو گیا ہے اس لیے یاد رکھیے کہ چونکہ شیعوں کا ایک بنیادی مسئلہ امامت کا بھی ہے اور "امام" ان کے نزدیک انبیاء کی طرح منجانب اللہ نامزد اور معصوم ہوتا ہے' حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی ان کے "بارہ اماموں" میں سے ایک "امام" ہیں۔

اس لیے وہ ان کے لیے ''امام'' کا لفظ بولتے ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ ایک صحابیؓ رسول ہیں ''امام معصوم'' نہیں نہ ہم شیعوں کی امامت معصومہ کے قائل ہی ہیں اس لیے ہمیں دیگر صحابہ کرام کی طرح ''حضرت حسین رضی اللہ عنہ'' لکھنا اور بولنا چاہیئے ''امام حسین علیہ السلام'' نہیں۔ کیونکہ یہ شیعوں کے معلوم عقائد اور مخصوص تکنیک کے غماز ہیں۔'' (الاعتصام ۱۱ محرم الحرام ۱۳۹۵ھ)

اتنی صراحت و وضاحت کے بعد بھی مدیر موصوف کا عدم اطمینان ناقابل فہم ہے اگر وہ اس فرق کی کچھ توضیح کر دیتے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ''امام'' نہ لکھنے سے تو ان کی توہین نہیں ہوتی لیکن حضرت حسین کے ساتھ ''امام'' نہ لکھنے سے ان کی توہین ہو جاتی ہے۔ تو ہم اپنے موقف پر نظرثانی کر لیتے۔ یہ عجیب انداز ہے کہ ہمارے دلائل کا کوئی جواب بھی نہیں اور اسی طرح اپنے دلائل کا اظہار بھی نہیں لیکن پھر بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی توہین کا بچکانہ اعتراض۔ ع

تمہی کہو یہ انداز ''تحقیق'' کیا ہے؟

باقی رہا حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ میں آپ کا عجیب قسم کا موازنہ! تو جواباً عرض ہے کہ حدیث و فقہ کے مسلمہ عالم و فقیہ کو امام لکھنا اگر آپ کے نزدیک حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر فوقیت دینا ہے جس کے لیے آپ دلیل شرعی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ تو ہمارا سوال آپ سے یہ ہے۔ کہ آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے تو ''امام'' نہیں لکھتے لیکن ائمہ اربعہ اور سینکڑوں علماء و فقہاء کو امام لکھتے ہیں تو کیا امام ابوحنیفہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ لکھ کر انہیں ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ سے فوقیت دیتے ہیں؟

((ماھو جوابکم فھو جوابنا))

پھر آپ امام ابوحنیفہ کو ''امام اعظم'' لکھتے ہیں۔ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے صرف ''امام'' اور امام ابوحنیفہ کے لیے ''امام اعظم'' کیا یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی توہین نہیں؟

اور آگے بڑھیے! آپ تمام صحابہ کرام کے لیے حضرت کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ

نبیؐ اکرم ﷺ کے لیے بھی بالعموم یہی لفظ "حضرت یا آنحضرت ﷺ" ہی استعمال ہوتا ہے لیکن آپ مولانا احمد رضا خان بریلوی کو "اعلیٰ حضرت" لکھتے اور بولتے ہیں۔ کیا اس طرح صحابہؓ کرام کی اور خود ختمی مرتبت ﷺ کی توہین نہیں؟

آخر یہ سوال لکھنے سے قبل اس کی سطحیت پر کچھ تو غور کر لیا ہوتا۔ اس لیے محترم! اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ علماء و فقہاء کے لیے "امام" کے لفظ کا استعمال اس معنی میں ہوتا ہے کہ وہ حدیث و فقہ کے ماہر تھے' حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے بھی اسے اس معنیٰ میں استعمال کیا جائے تو اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہیں بلکہ اس معنی میں وہ بعد کے ائمہ سے زیادہ اس لفظ کے مستحق ہیں۔ لیکن بات تو یہ ہو رہی ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اس معنی میں "امام" نہیں کہا جاتا اگر ایسا ہوتا تو ابوبکر و عمر و دیگر صحابہؓ کرام کو بھی امام لکھا اور بولا جاتا کہ وہ علوم قرآن و حدیث کے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ رمزشناس تھے۔ جب کسی بڑے سے بڑے صحابی کے لیے امام کا لفظ نہیں بولا جاتا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ صرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس لفظ کا استعمال ان معنوں میں قطعاً نہیں جن میں اس کا استعمال عام ہے' بلکہ یہ شیعیت کے مخصوص عقائد کا غماز ہے۔ اس لیے اہل سنت کو اس سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

امید ہے اب تو مدیر موصوف کی سمجھ میں یہ بات آ گئی ہو گی۔ اگر اب بھی اطمینان نہیں تو ہم اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں۔

یا رب! وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو' جو نہ دے مجھ کو زباں اور

سوال : ⑦ آپ کی تحریر کے مطابق اگر یزید مومن ہونے کے باعث رحمۃ اللہ علیہ کا مصداق ہے تو کیا اس منطق کے مطابق کسی مومن کہلانے والے زانی' شرابی' چور اور قاتل کو شخصی طور پر رحمۃ اللہ علیہ کہنا درست ہو گا؟"

جواب: ⑦ رحمۃ اللہ علیہ کا استعمال

یہ سوال بھی سطحیت پر مبنی ہے موصوف نے ذرا بھی غور و فکر سے کام لیا ہوتا تو اس سطحیت

کا مظاہرہ شاید نہ فرماتے۔ ہم موصوف سے سوال کرتے ہیں کہ کیا آج تک شخصی طور پر کسی زانی یا شرابی یا چور یا قاتل مسلمان کے لیے دعائے مغفرت و رحمت سے کسی عالم نے روکا ہے؟ اگر روکا ہے تو حوالہ دیں' اور اگر شرابی اور زانی کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا کرنی جائز ہے تو رحمۃ اللہ علیہ یا رحمہ اللہ کا مطلب بھی تو مغفرت و رحمت کی دعا ہے' اس کا مفہوم کچھ اور تو نہیں؟

اسی طرح ہم موصوف سے پوچھتے ہیں کہ آج تک کسی عالم نے کسی زانی یا شرابی یا چور یا قاتل مسلمان کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو حوالہ دیں بصورت دیگر از خود ایسے مجرموں کے لیے رحمۃ اللہ علیہ کہنا ثابت ہو گیا کیونکہ نماز جنازہ بھی تو مغفرت و رحمت کی دعا ہے۔ اگر ایک کبیرہ گناہ کے مرتکب کے لیے نماز جنازہ پڑھنی جائز ہے بلکہ ضرور پڑھی جاتی ہے تو پھر اسے رحمۃ اللہ علیہ یا رحمہ اللہ کہنے میں کیا حرج ہے؟ اگر یہ نکتہ اب بھی موصوف کے ذہن میں نہیں آیا تو ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ کسی کے لیے مغفرت و رحمت کے لیے دعا کرنے میں یا اس کی نماز جنازہ پڑھنے میں یا اس کے لیے رحمۃ اللہ علیہ کہنے میں کیا فرق ہے؟ ہمارے نزدیک تو تینوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ اگر موصوف کے نزدیک کچھ فرق ہے تو وضاحت فرمائیں کہ ان کے درمیان کیا فرق ہے؟ تاکہ ہمیں بھی معلوم ہو سکے کہ ایک مرتکب کبیرہ گناہ مسلمان کی نماز جنازہ تو پڑھنی جائز بلکہ ضروری ہے لیکن اس کے لیے رحمۃ اللہ علیہ کہنا جائز نہیں' اس لیے کہ ان کے درمیان یہ یہ فرق ہے۔ امید ہے موصوف ان سوالات کی وضاحت فرما کر ہمارا شک یا غلط فہمی دور کر دیں گے۔

سوال : ⑧ آپ نے غزوۂ قسطنطنیہ کے حوالے سے یزید کی مغفرت کی جو تصریح کی ہے۔ اس مغفرت سے کیا مراد ہے۔ اور محدثین و شراح بخاری نے اس حدیث سے کیا مراد لیا ہے اور یزید کے متعلق کیا تصریحات فرمائی ہیں اور ابن [1] مہلب کے قول کے متعلق کیا کہا ہے؟

---

[1] یہ "ابن مہلب" نہیں صرف "مہلب" ہے سائل کو غالبا مغالطہ لگا ہے یا قلم کا سہو ہے۔

جواب: ⑧ مسئلہ یزید کی مغفرت کا مغفرت سے مراد وہی ہے جو اس کا عام مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی بندے کے گناہوں کو نظر انداز کر کے اس کو معاف کر دینا' بخش دینا اور اپنے انعامات کا مستحق قرار دے دینا۔

باقی رہی بات کہ محدثین و شراح بخاری نے اس سے کیا مراد لیا ہے اور یزید کے متعلق کیا تصریحات فرمائی ہیں؟ اور "ابن مہلب" کے قول کے متعلق کیا کہا ہے؟ تو محترم مدیر صاحب! اگر ہماری مختصر تصریحات پر ذرا گہری نظر سے غور فرما لیتے تو شاید وہ یہ سوالات نہ کرتے کہ ہماری مختصر سی عبارت میں ان تمام باتوں کا جواب موجود ہے۔ مناسب ہے کہ ہم پہلے اپنے سابقہ مضمون کی وہ عبارت یہاں نقل کر دیں جس پر یہ سوال کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مزید گفتگو موزوں رہے گی۔ ہم نے لکھا تھا:

"کم از کم اہلسنّت کو حدیث کے مطابق ہی یزید کو برا بھلا کہنے سے باز رہنا چاہیئے جس میں رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ قسطنطنیہ میں شرکت کرنے والوں کے متعلق مغفرت کی بشارت دی ہے اور یزید اس جنگ کا کمانڈر تھا۔ یہ بخاری کی صحیح حدیث اور آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے' کسی کاہن یا نجومی کی پیشگوئی نہیں کہ بعد کے واقعات اسے غلط ثابت کر دیں۔

اگر ایسا ہو تو پھر نبی کے فرمان اور کاہن کی پیش گوئی میں فرق باقی نہ رہے گا۔ کیا ہم اس حدیث کی مضحکہ خیز تاویلیں کر کے یہی کچھ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔"

مدیر موصوف کو اگر ہماری اس بات سے اختلاف تھا تو ان کو بتلانا چاہیئے تھا کہ نبی کی بشارت اور نجومی کی پیشگوئی میں کوئی فرق ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ کیونکہ اس حدیث کی ایسی تاویل جس سے بشارت کا پہلو ختم ہو جائے' حضور ﷺ کے قول کو ایک کاہن کے قول سے زیادہ اہمیت نہ دینے پر ہی صحیح قرار پا سکتی ہے۔ اس کے بغیر جب غزوۂ قسطنطنیہ کے شرکاء میں سے کسی ایک کو بھی مغفرت کی بشارت سے خارج نہیں کیا جا سکتا تو ہمیں بتایا جائے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ حضور ﷺ کی پیش گوئی بھی اٹل ہو اور پھر اس میں سے کسی کا تخلّف بھی ہو جائے' بیک وقت دونوں باتیں ممکن نہیں۔

امام مہلب کے قول میں یہی تو کہا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ قول مشروط ہے اس

بات سے کہ ان شرکاء میں سے بعد میں کفر و ارتداد کا ارتکاب نہ ہوا ہو۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو وہ اس بشارت سے خارج ہو جائے گا لیکن اس تاویل میں کوئی وزن نہیں۔ معلوم نہیں صحیح بخاری کے جلیل القدر شارحین اس تاویل کو بغیر کسی رد و نقد کے کیوں نقل کرتے آئے ہیں؟ حالانکہ یہ تاویل بالکل ویسی ہی ہے جیسی تاویل شیعہ حضرات صحابہ کرام رضوان علیہم اجمعین کے بارے میں کرتے ہیں۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے آنحضرت ﷺ کی زندگی میں صحابہ کو "رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْاعَنْہُ" کا سرٹیفکیٹ دیا گیا تھا۔ لیکن آپ کی وفات کے بعد چونکہ (نعوذ باللہ) وہ مرتد ہو گئے' اس لیے وہ اس کے مستحق نہیں رہے۔ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ لغو تاویل آپ کے نزدیک قابل قبول نہیں تو پھر یزید کے بارے میں یہ تاویل کیوں کر صحیح ہو جائے گی؟

پھر محض امکان کفر و ارتداد کو وقوع کفر و ارتداد سمجھ لینا بھی سمجھ سے بالا تر ہے۔ مان لیجئے کہ حضور ﷺ کی پیش گوئی مشروط ہے اور کفر و ارتداد کرنے والے اس سے خارج ہو جائیں گے لیکن اس کے بعد اس امر کا ثبوت بھی تو پیش کیجیے کہ یزید کافر و مرتد ہو گیا تھا اور پھر اسی کفر و ارتداد پر اس کا خاتمہ بھی ہوا' جب تک آپ اس کا واقعی ثبوت پیش نہیں کریں گے بشارت نبوی کو مشروط ماننے سے بھی آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ قتل حسین رضی اللہ عنہ کا حکم یا اس پر رضا مندی یہی کفر و ارتداد ہے تو یہ بھی لغو ہے۔ اول تو اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم دیا یا اس پر رضا مندی کا اظہار کیا' جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصریح کی ہے' وہ لکھتے ہیں:

«مَا صَحَّ قَتْلُهُ لِلْحُسَيْنِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَلاَ أَمْرُهُ وَلاَ رِضَاهُ بِذٰلِكَ»

(وفيات الأعيان: ٢/ ٤٥٠)

"حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یزید کا قتل کرنا یا ان کے قتل کرنے کا حکم دینا یا ان کے قتل پر راضی ہونا' ان میں سے کوئی بات بھی ثابت نہیں۔"

اور احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:

«فَإِنْ قِيْلَ هَلْ يَجُوْزُ لَعْنُ يَزِيْدَ بِكَوْنِهِ قَاتِلَ الْحُسَيْنِ أَوْ آمِرًا بِهِ قُلْنَا هٰذَا لَمْ يَثْبُتْ أَصْلاً وَلاَ يَجُوْزُ أَنْ يُقَالَ إِنَّهُ قَتَلَهُ أَوْ أَمَرَ بِهِ مَا لَمْ يَثْبُتْ»(أحياء العلوم: ٣/ ١٣١)

"اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا یزید پر لعنت کرنی جائز ہے' کیونکہ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قاتل ہے یا ان کے قتل کا حکم دینے والا ہے تو ہم جواب میں کہیں گے کہ یہ باتیں قطعاً ثابت نہیں ہیں اور جب تک کوئی ثبوت نہ ہو اس کے متعلق یہ کہنا جائز نہیں کہ اس نے قتل کیا یا قتل کا حکم دیا۔"

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یزید ہی نے قتل کا حکم دیا تب بھی حکم قتل تو کجا' اگر وہ خود ہی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والا ہوتا تب بھی محض قتل سے کافر و مرتد قرار نہیں پا سکتا چہ جائے کہ حکم قتل سے۔ یہ بھی ایک کبیرہ گناہ ہی ہے' کفر وارتداد نہیں۔ چنانچہ ملا علی قاری حنفی لکھتے ہیں:

«عَلٰى أَنَّ الأَمْرَ بِقَتْلِ الْحُسَيْنِ بَلْ قَتْلُهُ لَيْسَ مُوْجِبًا لِّلَعْنَةِ عَلٰى مُقْتَضٰى مَذْهَبِ أَهْلِ السُّنَّةِ مِنْ أَنَّ صَاحِبَ الْكَبِيْرَةِ لاَ يُكَفَّرُ فَلاَ يَجُوْزُ عِنْدَهُمْ لَعْنُ الظَّالِمِ الْفَاسِقِ كَمَا نَقَلَهُ جَمَاعَةٌ يَعْنِىْ بِعَيْنِهٖ»

(ضوء المعالى على بدء الأمالي ص: ٨٦، طبع جديد)

"حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم دینا بلکہ خود ان کا قتل کر دینا بھی مذہب اہل سنت کے مقتضی کے مطابق لعنت کا موجب نہیں' (اس لیے کہ یہ کبیرہ گناہ ہی ہے) اور مرتکب کبیرہ گناہ کو کافر نہیں کہا جا سکتا۔ پس اہل سنت کے نزدیک کسی ظالم' فاسق شخص کے لیے متعین طور پر لعنت کرنی جائز نہیں۔"

ایک اور حنفی بزرگ مولانا اخوند درویزہ اسی قصیدہ امالی کی شرح میں لکھتے ہیں:

"مذہب اہل سنت و جماعت آں ست کہ لعنت بغیر از کافر مسلمان را نیامدہ است۔ پس یزید کافر نبود بلکہ مسلمان سنی بود و کسے بہ گناہ کردن کافر نمی شود در تمہید آوردہ است کہ قاتل حسین را نیز کافر نباید گفت۔ زیرا کہ بہ گناہ کردن کسے کافر نمی شود۔" (شرح قصیدہ

امالی، طبع ۱۳۱۷ھ لاہور)

"اہل سنت کا مذہب ہے کہ لعنت کرنا سوائے کافر کے کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں یزید کافر نہیں، سنی مسلمان تھا اور کوئی شخص محض گناہ کر لینے سے کافر نہیں ہوتا۔ تمہید میں ہے کہ خود قاتل حسین رضی اللہ عنہ کو بھی کافر نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ گناہ کر لینے سے کوئی شخص کافر نہیں ہوتا۔"

الغرض یزید کو مغفرت کی بشارت نبوی سے کسی طرح بھی خارج نہیں کیا جا سکتا' جن لوگوں نے ایسی کوشش کی ہے ان کے پاس سوائے بغض یزید اور جذبۂ حب حسین رضی اللہ عنہ کے کوئی معقول دلیل نہیں۔

سب سے زیادہ تعجب مدیر "رضائے مصطفیٰ" اور ان کے ہمنواؤں پر ہے کہ ایک طرف وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عَالِمِ مَاکَانَ وَمَا یَکُوْنُ تسلیم کرتے ہیں اور دوسری طرف آپ کی دی ہوئی بشارت میں سے یزید کو خارج کرنے میں کوشاں ہیں۔ ہم تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب تسلیم نہیں کرتے۔ البتہ بشارات کا منبع وحیٔ الٰہی کو مانتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ مستقبل کے متعلق جتنی بھی پیش گوئیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے علم اور وحی پا کر کی ہیں جو کبھی غلط نہیں ہو سکتیں اور آپ تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عالم الغیب مانتے ہیں لیکن پھر بھی ان کی پیش گوئی پر اعتقاد نہیں' کیسی عجیب بات ہے؟ آپ کے نزدیک اس بات کا کیا جواب ہے کہ جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ قسطنطنیہ کے شرکاء کی مغفرت کی خبر دی' اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ علم تھا یا نہیں کہ اس میں یزید جیسا شخص بھی شامل ہو گا؟ اور یہ بھی آپ کو علم تھا یا نہیں کہ یزید بعد میں کافر و مرتد ہو جائے گا؟ اگر ان دونوں باتوں کا آپ کو اس وقت علم تھا تو پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یزید کو مغفرت کی بشارت سے خارج کیوں نہیں کیا؟ اور علم ہوتے ہوئے اگر آپ نے یزید کو خارج نہیں کیا تو اس کا مطلب کیا ہے؟ امید ہے مدیر موصوف اپنے عقیدۂ علم غیب کے مطابق ان سوالات کی وضاحت ضرور فرمائیں گے۔

بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ قسطنطنیہ کے شرکاء کی مغفرت کی جو پیش گوئی فرمائی

ہے وہ بالکل برحق ہے اور یقیناً وہ سب مَغْفُوْرٌ لَھُمْ ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی کافر یا مرتد ہونے والا ہوتا تو آپ اس کی بھی وضاحت فرما دیتے اس لیے وہ سب شرکائے غزوہ یقیناً مسلمان تھے' غزوہ کے بعد ان کے کفر و ارتداد کا امکان محض ایک واہمہ' سفسطہ اور مفروضہ ہے۔ بشارت کا اقتضاء تو یہ ہے کہ ان کا خاتمہ بہرحال ایمان و اسلام ہی پر ہونا چاہیے اور یہی ہمارا اعتقاد ہے کیونکہ اس اعتقاد کے بغیر ایک نبی کی پیش گوئی اور کاہن و نجومی کی پیش گوئی میں فرق باقی نہیں رہ جاتا ہے۔ نبی ﷺ کی توہین کی ایسی جسارت ہم نہیں کر سکتے یہ تو انہی لوگوں کا جگرا ہے جو "عشق رسول" کے ٹھیکیدار بھی بنے پھرتے ہیں اور آپ کی پیش گوئی کو ایک نجومی کے اٹکل پچو سے زیادہ حیثیت دینے کے لیے بھی تیار نہیں۔ معاذاللہ!

حرف آخر | ان سوالات کے آخر میں مدیر "رضائے مصطفیٰ" نے لکھا ہے۔

نوٹ: جواب مختصر' جامع اور مدلل و جلدی ہونا چاہیے۔"

جواب ہم نے موصوف کی خواہش پر اپنے علم و فہم کے مطابق جامع و مدلل جواب دے دیے ہیں۔ مدیر موصوف سے متوقع ہیں کہ وہ حزبی تعصب اور جذباتی وابستگی سے بالا تر ہو کر ہماری معروضات پر غور فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح فہم عطا فرمائے۔

«اَللّٰھُمَّ أَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَالْبَاطِلَ بَاطِلاً وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ»

لیکن افسوس ہے کہ مدیر "رضائے مصطفیٰ" نے ہمارے دلائل کا آج تک کوئی جواب نہیں دیا' جس سے قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس کا موقف مضبوط اور وزنی ہے۔



-- ۸ --

یزید کو رحمۃ اللہ علیہ کہنا نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے

﴿امام غزالی کا فتویٰ﴾

مذکورہ مضمون میں متعدد جگہ امام غزالی کے جس فتویٰ کا ذکر آیا ہے اور اس کی بعض عبارتیں نقل ہوئی ہیں وہ پورا فتویٰ افادۂ عام کی غرض سے ذیل میں مع ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

«وَقَدْ أَفْتَى الإِمَامُ أَبُوْحَامِدِ الْغَزَالِيُّ رَحِمَهُ اللهُ تَعَالٰى . . . فَإِنَّهُ سُئِلَ عَمَّنْ صَرَّحَ بِلَعْنِ يَزِيْدَ هَلْ يُحْكَمُ بِفِسْقِهِ أَمْ هَلْ يَكُوْنُ ذٰلِكَ مُرَخَّصًا فِيْهِ؟ وَهَلْ كَانَ مُرِيْدًا قَتْلَ الْحُسَيْنِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَم كَانَ قَصْدُهُ الدَّفْعَ؟ وَهَلْ يَسُوْغُ التَّرَحُّمُ عَلَيْهِ أَمِ السُّكُوْتُ عَنْهُ أَفْضَلُ؟ يُنْعِمُ بِإِزَالَةِ الاِشْتِبَاهِ مُثَابًا فَأَجَابَ

لاَ يَجُوزُ لَعْنُ الْمُسْلِمِ أَصْلاً وَّمَنْ لَعَنَ مُسْلِمًا فَهُوَ الْمَلْعُوْنُ وَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ "الْمُسْلِمُ لَيْسَ بِلَعَّانٍ" وَكَيْفَ يَجُوْزُ لَعْنُ الْمُسْلِمِ وَلاَ يَجُوْزُ لَعْنُ الْبَهَائِمِ وَقَدْ وَرَدَ النَّهْيُ عَنْ ذٰلِكَ وَحُرْمَةُ الْمُسْلِمِ أَعْظَمُ مِنْ حُرْمَةِ الْكَعْبَةِ بِنَصِّ النَّبِيِّ ﷺ وَيَزِيْدُ صَحَّ إِسْلاَمُهُ وَمَا صَحَّ قَتْلُهُ الْحُسَيْنَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ وَلاَ أَمْرُهُ وَلاَ رِضَاهُ بِذٰلِكَ وَمَهْمَا لَمْ يَصِحَّ ذٰلِكَ مِنْهُ لاَ يَجُوْزُ أَنْ يُظَنَّ ذٰلِكَ بِهِ فَإِنَّ إِسَاءَةَ الظَّنِّ بِالْمُسْلِمِ أَيْضًا حَرَامٌ وَقَدْ قَالَ تَعَالٰى ﴿ اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ﴾ وَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ إِنَّ اللهَ حَرَّمَ مِنَ الْمُسْلِمِ دَمَهُ وَمَالَهُ وَعِرْضَهُ وَأَنْ يُظَنَّ بِهِ ظَنَّ السَّوْءِ وَمَنْ زَعَمَ أَنَّ يَزِيْدَ أَمَرَ بِقَتْلِ الْحُسَيْنِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَوْ رَضِيَ بِهِ فَيَنْبَغِيْ أَنْ يُعْلَمَ

بِهِ غَايَةَ حِمَاقَةٍ فَإِنَّ مَنْ قُتِلَ مِنَ الأَكَابِرِ وَالْوُزَرَآءِ وَالسَّلاَطِيْنِ فِيْ عَصْرِهِ لَوْ أَرَادَ أَنْ يَّعْلَمَ حَقِيْقَةَ مَنِ الَّذِيْ أَمَرَ بِقَتْلِهِ وَمَنِ الَّذِيْ رَضِيَ بِهِ وَمَنِ الَّذِيْ كَرِهَهُ لَمْ يَقْدِرْ عَلٰى ذٰلِكَ وَإِنْ كَانَ قَدْ قُتِلَ فِيْ جِوَارِهِ وَزَمَانِهِ وَهُوَ يُشَاهِدُهُ، فَكَيْفَ لَوْ كَانَ فِيْ بَلَدٍ بَعِيْدٍ وَّزَمَنٍ قَدِيْمٍ قَدِ انْقَضٰى، فَكَيْفَ يُعْلَمُ ذٰلِكَ فِيْمَا انْقَضٰى عَلَيْهِ قَرِيْبٌ مِّنْ أَرْبَعِ مِائَةِ سَنَةٍ فِيْ مَكَانٍ بَعِيْدٍ؟

وَقَدْ تَطَرَّقَ التَّعَصُّبُ فِي الْوَاقِعَةِ فَكَثُرَتْ فِيْهَا الأَحَادِيْثُ مِنَ الْجَوَانِبِ فَهٰذَا أَمْرٌ لاَ تُعْرَفُ حَقِيْقَتُهُ أَصْلاً وَإِذَا لَمْ يُعْرَفْ وَجَبَ إِحْسَانُ الظَّنِّ بِكُلِّ مُسْلِمٍ يُّمْكِنُ إِحْسَانُ الظَّنِّ بِهِ وَمَعَ هٰذَا فَلَوْ ثَبَتَ عَلَى مُسْلِمٍ أَنَّهُ قَتَلَ مُسْلِمًا فَمَذْهَبُ أَهْلِ الْحَقِّ أَنَّهُ لَيْسَ بِكَافِرٍ وَالْقَتْلُ لَيْسَ بِكُفْرٍ بَلْ هُوَ مَعْصِيَةٌ وَإِذَا مَاتَ الْقَاتِلُ فَرُبَمَا مَاتَ بَعْدَ التَّوْبَةِ وَالْكَافِرُ لَوْ تَابَ مِنْ كُفْرِهِ لَمْ تَجُزْ لَعْنَتُهُ فَكَيْفَ مَنْ تَابَ عَنْ قَتْلٍ؟ ﴿وَهُوَ ٱلَّذِى يَقۡبَلُ ٱلتَّوۡبَةَ عَنۡ عِبَادِهِۦ﴾ فَإِذَنْ لاَ يَجُوْزُ لَعْنُ أَحَدٍ مِّمَّنْ مَاتَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَمَنْ لَعَنَهُ كَانَ فَاسِقًا عَاصِيًا لله تَعَالٰى وَلَوْ جَازَ لَعْنُهُ فَسَكَتَ لَمْ يَكُنْ عَاصِيًا بِالإِجْمَاعِ بَلْ لَوْ لَمْ يَلْعَنْ إِبْلِيْسَ طُوْلَ عُمُرِهِ لاَ يُقَالُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لِمَ لَمْ تَلْعَنْ إِبْلِيْسَ؟ وَيُقَالُ لِلاَعِنٍ لِمَ لَعَنْتَ؟ وَمِنْ أَيْنَ عَرَفْتَ أَنَّهُ مَطْرُوْدٌ مَلْعُوْنٌ؟ وَالْمَلْعُوْنُ هُوَ الْمُبْعَدُ مِنَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَذٰلِكَ غَيْبٌ لاَ يُعْرَفُ إِلاَّ فِيْمَنْ مَاتَ كَافِرًا فَإِنَّ ذٰلِكَ عُلِمَ بِالشَّرْعِ

وَأَمَّا التَّرَحُّمُ عَلَيْهِ فَهُوَ جَائِزٌ بَلْ هُوَ مُسْتَحَبٌّ بَلْ هُوَ دَاخِلٌ فِيْ قَوْلِنَا فِيْ كُلِّ صَلٰوةٍ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ فَإِنَّهُ كَانَ مُؤْمِنًا»(وفيات الأعيان لابن خلكان: ۳/۲۸۸، طبع بيروت ۱۹۷۰ء)

"امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ اس شخص کے متعلق کیا حکم ہے۔ جو یزید پر لعنت کرتا ہے؟ کیا اس پر فسق کا حکم لگایا جا سکتا ہے؟ کیا اس پر لعنت کا جواز ہے؟ کیا یزید فی الواقع حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا یا اس کا مقصد صرف اپنی مدافعت تھا؟ اس کو "رحمۃ اللہ علیہ" کہنا بہتر ہے یا اس سے سکوت افضل ہے۔"

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا مسلمان پر لعنت کرنے کا قطعاً کوئی جواز نہیں' جو شخص کسی مسلمان پر لعنت کرتا ہے وہ خود ملعون ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"مسلمان لعنت کرنے والا نہیں ہوتا۔" علاوہ ازیں ہمیں تو ہماری شریعت اسلامیہ نے بہائم (جانوروں) تک پر لعنت کرنے سے روکا ہے تو پھر کسی مسلمان پر لعنت کرنا کس طرح جائز ہو جائے گا؟ جبکہ ایک مسلمان کی حرمت (عزت) حرمت کعبہ سے بھی زیادہ ہے جیسا کہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مذکور ہے۔ (سنن ابن ماجہ)

یزید کا اسلام صحیح طور پر ثابت ہے جہاں تک حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے واقعے کا تعلق ہے سو اس بارے میں کوئی صحیح ثبوت موجود نہیں کہ یزید نے انہیں قتل کیا یا ان کے قتل کا حکم دیا یا اس پر رضامندی ظاہر کی۔ جب یزید کے متعلق یہ باتیں پایۂ ثبوت ہی کو نہیں پہنچتیں تو پھر اس سے بدگمانی کیونکر جائز ہو گی؟ جبکہ مسلمان کے متعلق بدگمانی کرنا بھی حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "تم خواہ مخواہ بدگمانی کرنے سے بچو کہ بعض دفعہ بدگمانی بھی گناہ کے دائرے میں آ جاتی ہے" اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"اللہ تعالیٰ نے مسلمان کے خون' مال' عزت و آبرو اور اس کے ساتھ بدگمانی کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔"

جس شخص کا خیال ہے کہ یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم دیا یا ان کے قتل کو پسند کیا' وہ پرلے درجے کا احمق ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ ایسا گمان کرنے والے کے دور میں کتنے ہی اکابر' وزراء اور سلاطین کو قتل کیا گیا لیکن وہ اس بات کا پتہ چلانے سے قاصر رہا کہ کن لوگوں نے ان کو قتل کیا اور کن لوگوں نے اس قتل کو پسند یا ناپسند کیا دراں حالیکہ ان کے قتل اس کے بالکل قرب میں اور اس کے زمانے میں ہوئے اور اس نے ان کا

خود مشاہدہ کیا۔ پھر اس قتل کے متعلق (یقینی اور حتمی طور پر) کیا کہا جا سکتا ہے جو دور دراز کے علاقے میں ہوا اور جس پر چار سو سال (امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے دور تک) کی مدت بھی گزر چکی ہے۔

علاوہ ازیں اس سانحے پر تعصب و گروہ بندی کی دبیز تہیں چڑھ گئی ہیں اور روایتوں کے انبار لگا دیے گئے ہیں جس کی بنا پر اصل حقیقت کا سراغ لگانا ناممکن ہے' جب واقعہ یہ ہے کہ حقیقت کی نقاب کشائی ممکن ہی نہیں تو ہر مسلمان کے ساتھ حسن ظن رکھنا ضروری ہے۔ پھر اہل حق (اہل سنت) کا مذہب تو یہ ہے کہ کسی مسلمان کے متعلق یہ ثابت بھی ہو جائے کہ اس نے کسی مسلمان کو قتل کیا ہے تب بھی وہ قاتل مسلمان' کافر نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ جرم قتل کفر نہیں ایک معصیت (گناہ) ہے۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلمان قاتل مرنے سے پہلے پہلے اکثر توبہ کر ہی لیتا ہے اور شریعت کا حکم تو ہے کہ اگر کوئی کافر بھی کفر سے توبہ کر لے اس پر بھی لعنت کی اجازت نہیں' پھر یہ لعنت ایسے مسلمان کے لیے کیوں کر جائز ہو گی جس نے مرنے سے پہلے جرم قتل سے توبہ کر لی ہو؟

آخر کسی کے پاس اس امر کی کیا دلیل ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل کو توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوئی اور وہ توبہ کیے بغیر ہی مر گیا ہے جب کہ اللہ کا در توبہ ہر وقت وا ہے۔ ﴿ وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ ﴾ (الشوریٰ : ۴۲/۲۵)

بہرحال کسی لحاظ سے بھی ایسے مسلمان پر لعنت کرنا جائز نہیں جو مر چکا ہو' جو شخص کسی مرے ہوئے مسلمان پر لعنت کرے گا وہ خود فاسق اور اللہ کا نافرمان ہے۔

اگر (بالفرض) لعنت کرنا جائز بھی ہو لیکن وہ لعنت کی بجائے سکوت اختیار کیے رکھے تو ایسا شخص بالا جماع گناہ گار نہ ہو گا بلکہ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں ایک مرتبہ بھی ابلیس پر لعنت نہیں بھیجتا تو قیامت کے روز اس سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تو نے ابلیس پر لعنت کیوں نہیں کی؟

البتہ اگر کسی نے کسی مسلمان پر لعنت کی تو قیامت کے روز اس سے ضرور پوچھا جا سکتا ہے کہ تو نے اس پر لعنت کیوں کی تھی؟ اور تجھے یہ کیوں کر معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ملعون اور

راندۂ درگاہ ہے؟ جب کہ کسی کے کفر و ایمان کا مسئلہ امور غیب سے ہے جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ہاں شریعت کے ذریعے ہمیں یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ جو شخص کفر کی حالت میں مرے، وہ ملعون ہے۔

جہاں تک یزید کو "رحمۃ اللہ علیہ" یا "رحمہ اللہ" کہنے کا تعلق ہے تو یہ نہ صرف جائز بلکہ مستحب (اچھا فعل) ہے بلکہ وہ از خود ہماری ان دعاؤں میں شامل ہے جو ہم تمام مسلمانوں کی مغفرت کیلئے کرتے ہیں کہ ((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ)) "یا اللہ! تمام مومن مردوں اور عورتوں کو بخش دے" اس لیے کہ یزید بھی یقیناً مومن تھا۔" (وفیات الاعیان، ۲۸۸/۳، طبع بیروت)



-- ۹ --

غزوۂ قسطنطنیہ کی سپہ سالاری

﴿ایک تاریخی حوالے کی وضاحت﴾

غزوۂ قسطنطنیہ سے متعلق صحیح بخاری کی جو روایت پہلے متعدد مقامات پر زیر بحث آ چکی ہے، جس میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ اس غزوے میں شریک ہونے والے افراد مغفور (بخشے ہوئے) ہیں۔ تمام قدیم کتب تواریخ اس امر پر متفق ہیں کہ اس غزوے کے امیر لشکر یزید بن معاویہ تھے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے مسند احمد کی ایک روایت ہے جس میں صاف وضاحت ہے کہ:

«أَنَّ يَزِيْدَ بْنَ مُعَاوِيَةَ كَانَ أَمِيْرًا عَلَى الْجَيْشِ الَّذِيْ غَزَا فِيْهِ أَبُوْ أَيُّوْبَ» (مسند أحمد: ٥/٤١٦، طبع جديد)

''اس لشکر قسطنطنیہ کے امیر جس میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے، یزید بن معاویہ تھے۔''

اسی طرح قدیم تاریخوں مثلاً ابن سعد (متوفی ۲۳۰ ھ) کی الطبقات الکبریٰ، ابن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ ھ) کی تاریخ الامم والملوک (ج:۴، ص:۱۷۳) اور خلیفہ بن خیاط (متوفی ۲۴۰ ھ) کی تاریخ (ج:۱، ص:۱۹۶) میں بسلسلہ زیر بحث غزوہ قسطنطنیہ، یزید بن معاویہ کی شمولیت کا ذکر اس انداز ہی سے آیا ہے کہ وہ امیر لشکر تھے۔ یہ تو اولین اور قدیم ترین تاریخیں ہیں بعد کے مؤرخین میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (متوفی ۷۷۴ ھ) کا جو پایہ ہے، وہ محتاج بیان نہیں انہوں نے اپنی تاریخ کی مشہور کتاب البدایہ والنہایۃ کے متعدد مقامات پر اس کی صراحت کی ہے۔ ج:۸، ص:۵۹ پر مسند احمد کی متذکرہ بالا روایت بھی نقل کی ہے اور ص:۵۸ پر ہے کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق ان کی نماز جنازہ یزید نے پڑھائی۔

«وَكَانَ فِيْ جَيْشٍ يَزِيْدُ بْنُ مُعَاوِيَةَ وَإِلَيْهِ أَوْصٰى وَهُوَ الَّذِيْ صَلّٰى عَلَيْهِ»(البداية والنهاية: ٨/ ٦٠-٦١)

اسی جلد کے ص:۱۵۱ پر لکھا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اس لشکر میں موجود تھے۔

«وَقَدْ كَانَ فِي الْجَيْشِ الَّذِيْنَ غَزَوُا الْقُسْطُنْطِيْنِيَّةَ مَعَ ابْنِ مُعَاوِيَةَ يَزِيْدَ»

(البداية والنهاية: ٨/ ١٥٣)

اور ص ۲۲۹ میں یزید رحمہ اللہ کے حالات میں لکھا ہے۔

«وَقَدْ كَانَ يَزِيْدُ أَوَّلَ مَنْ غَزَا مَدِيْنَةَ قُسْطُنْطِيْنِيَّةَ»(البداية والنهاية: ٨/ ٢٣٢)

اسی طرح ابن عبدالبر (متوفی ۴۶۳ ھ) کی کتاب "الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب" ج:۱' ص:۱۵۷۔ امام سہیلی رحمہ اللہ (متوفی ۵۸۱ ھ) کی الروض الانف (شرح سیرت ابن ہشام) ج:۲' ص:۲۴۶۔ حافظ ابن حجر کی کتاب "الاصابہ فی تمیز الصحابہ" ج:۲' ص:۹۰ میں اسی حقیقت کا اثبات کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں شروح بخاری "فتح الباری" ج:۶' ص:۱۲۵' (طبع دارالسلام) اور "عمدۃ القاری" میں بھی حدیث ((يَغْزُوْنَ مَدِيْنَةَ قَيْصَرَ)) کی شرح کرتے ہوئے یہی کچھ لکھا گیا ہے۔

حدیث اور تاریخ کے ان تمام حوالوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ جس لشکر کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مَغْفُوْرٌ لَهُمْ (وہ بخشا ہوا ہے) فرمایا ہے اس کے امیر یزید بن معاویہ ہی تھے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ.

اس تاریخی حقیقت کے برعکس بعض لوگ یزید کو اس شرف سے محروم کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ زیر بحث لشکر کے امیر حضرت سفیان بن عوف تھے' یزید نہ تھے۔ لیکن تاریخی دلائل اس رائے کی تغلیط و تردید کرتے ہیں۔ جیسا کہ محولہ بالا عبارتوں سے واضح ہے۔ غالباً ایسے لوگوں کے سامنے ابن الاثیر (متوفی ۶۳۰ ھ) کی الکامل اور ابن خلدون (متوفی ۸۰۸ ھ) کی تاریخ ہے حالانکہ ان کے بیانات سے بھی ان کی رائے کی تائید نہیں ہوتی۔

ابن الاثیر نے اس سلسلے میں یہ لکھا ہے کہ:

"حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے قسطنطنیہ کی طرف کثیر فوج روانہ کی' حضرت سفیان بن عوف

کو اس کا امیر مقرر کیا اور اپنے لڑکے یزید کو بھی اس فوج میں شامل ہونے کو کہا لیکن وہ ساتھ جانے کے لیے تیار نہیں ہوا' لشکر وہاں پہنچا اور خبر آئی کہ وہ مصائب سے دو چار ہو گیا ہے اس پر یزید کی خواہش کے مطابق جم غفیر لشکر کا اضافہ کیا جن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ' حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ' ابن زبیر رضی اللہ عنہ اور ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ وغیرہ بہت سے لوگ تھے۔ (ملخصاً از تاریخ ابن الاثیر (ج ۳' ص ۲۲۷)

تاریخ ابن خلدون میں بھی (غالباً) اسی سے ماخوذ تقریباً ایسا ہی درج ہے۔ (ج:۳' ص:۹ طبع بیروت ۱۹۷۱ء)

اولاً : یہ دونوں کتابیں بعد کی ہیں جب کہ قدیم تاریخوں میں (جو بنیادی مآخذ ہیں) یزید ہی کو لشکر کا سپہ سالار بتلایا گیا ہے جیسا کہ پہلے سارے حوالے درج کیے جا چکے ہیں۔

ثانیًا : ابن الاثیر اور ابن خلدون کی بیان کردہ تفصیل کو اگر پہلے مؤرخین کی مذکورہ تصریحات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس میں صرف اتنا اضافہ ملتا ہے کہ یزید سے پہلے ایک لشکر سفیان بن عوف کی قیادت میں بھیجا گیا لیکن بوجوہ وہ لشکر کوئی کارکردگی پیش نہ کر سکا جس کے بعد یزید کی سپہ سالاری (قیادت) میں وہ لشکر بھیجا گیا جس نے وہاں جا کر جہاد کیا اور یوں یزیدی لشکر ہی غزوہ قسطنطنیہ کا اولین غازی اور بشارت نبوی کا مصداق قرار پایا۔ بنا بریں تمام مؤرخین کا یزید ہی کو اس لشکر قسطنطنیہ کا سپہ سالار قرار دینا بالکل صحیح ہے۔ اور ابن الاثیر اور ابن خلدون کی تفصیل بھی اس کے مناقض نہیں' گو اس میں ایک بات کا اضافہ ضرور ہے' تاہم اس اضافے سے یزید کو اس شرف سے محروم کرنے کی کوشش غیر صحیح اور بے بنیاد ہے۔ یہ بات تو خود ابن الاثیر کے اپنے ذہن میں بھی نہیں تھی جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب اسد الغابہ میں یزید ہی کو لشکر قسطنطنیہ کا سپہ سالار لکھا ہے۔ (ج:۲' ص:۸۸- ج:۵' ص:۱۴۵ طبع قدیم' ترجمہ' ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ)



-- ۱۰ --

سانحۂ کربلا اور حضرت حسین و یزید

﴿شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی نظر میں﴾

سانحۂ شہادت حسین رضی اللہ عنہ اور واقعات کربلا کے موضوع پر آج سے کئی صدیاں قبل شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (۶۶۱-۷۲۸ھ) نے جو کچھ لکھا تھا' وہ حق و اعتدال کا ایک بہترین نمونہ' دلائل و براہین کا نادر مرقع اور خدا داد فہم صحیح کا شاہکار ہے' انہوں نے اپنی تالیفات میں متعدد مقامات پر اس کو موضوع بحث بنایا ہے۔ بالخصوص "منہاج السنۃ" میں اس پر بڑی عمدہ بحث فرمائی ہے جس کی ضروری تلخیص مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم نے اردو میں کر کے شائع کر دی تھی۔ اس کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر ہم ذیل میں امام موصوف کی وہ ترجمہ شدہ تحریر بھی قدرے ترمیم کے ساتھ پیش کر رہے ہیں' آیات و احادیث کے عربی الفاظ کا' اصل کتاب سے مراجعت کر کے' ہم نے اضافہ کردیا ہے۔ (مرتب)

تمہید علماء اسلام میں کوئی ایک بھی یزید بن معاویہ کو ابوبکر' عمر' عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کی طرح خلفائے راشدین میں سے نہیں سمجھتا۔ حدیث میں آیا ہے کہ:

«خِلاَفَةُ النُّبُوَّةِ ثَلاَثُوْنَ سَنَةً ثُمَّ يُؤْتِي اللهُ الْمُلْكَ مَنْ يَّشَآءُ»
(سنن أبي داود، السنة، باب في الخلفاء، ح:٤٦٤٧)

"خلافت تیس برس تک منہاج نبوت پر رہے گی پھر سلطنت ہو جائے گی۔"

علماء اہل سنت اس حدیث کے مطابق یزید اور اس جیسے آدمی اور عباسی خلفاء کو محض فرمانروا بادشاہ اور اسی معنی میں خلیفہ خیال کرتے ہیں۔ ان کا یہ خیال بالکل درست ہے۔ یہ ایک محسوس واقعہ ہے جس سے انکار غیر ممکن ہے کیونکہ یزید اپنے زمانے میں عملاً ایک بادشاہ' ایک حکمران' ایک صاحب سیف اور خود مختار فرمانروا تھا۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد تخت پر بیٹھا اور شام' مصر' عراق خراسان وغیرہ اسلامی ممالک میں اس کا حکم نافذ ہوا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ قبل اس کے کہ کسی ملک پر بھی حاکم ہوں' یوم عاشوراء ۶۱ھ میں شہید

ہو گئے اور یہی یزید کی سلطنت کا پہلا سال ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ

بلاشبہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے یزید سے اختلاف کیا اور باشندگان مکہ و حجاز نے ان کا ساتھ دیا لیکن یہ واقعہ ہے کہ حضرت عبداللہ نے خلافت کا دعوی یزید کی زندگی میں نہیں کیا بلکہ اس کے مرنے کے بعد کیا۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ شروع شروع میں اختلاف کرنے کے باوجود عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ یزید کے جیتے جی ہی اس کی بیعت پر رضامند ہو گئے تھے مگرچونکہ اس نے یہ شرط لگا دی تھی کہ قید ہو کر ان کے حضور میں حاضر ہوں اس لیے بیعت رہ گئی اور باہم جنگ برپا ہوئی۔ پس اگرچہ یزید تمام بلاد اسلامیہ کا حکمران نہیں ہوا۔ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کا ماتحت علاقہ اس کی اطاعت سے برابر برگشتہ رہا' تاہم اس سے اس کی بادشاہت اور خلافت میں شبہ نہیں ہو سکتا کیونکہ خلفائے ثلاثہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ' عمر رضی اللہ عنہ ' عثمان رضی اللہ عنہ ' اور پھر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما ' عبدالملک بن مروان اور اس کی اولاد کے سوا کوئی بھی اموی یا عباسی خلیفہ پورے بلاد اسلامیہ کا تنہا فرمانروا نہیں ہوا۔ حتی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں بھی تمام دنیائے اسلام کی حکومت نہ تھی۔

بادشاہوں پر خلیفہ کا اطلاق؟

پس اگر اہل سنت ان بادشاہوں میں سے کسی کو خلیفہ یا امام کہتے ہیں تو اس سے مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے میں خود مختار تھا' طاقتور تھا' صاحب سیف تھا۔ عزل و نصب کرتا تھا' اپنے احکام کے اِجراء کی قوت رکھتا تھا۔ حدود شرعی قائم کرتا تھا کفار پر جہاد کرتا تھا۔ یزید کو بھی امام و خلیفہ کہنے سے یہی مطلب ہے اور یہ ایک ایسی واقعی بات ہے کہ اس کا انکار غیر ممکن ہے۔ یزید کے صاحب اختیار بادشاہ ہونے سے انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اس واقعے سے انکار کر دے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ' عمر رضی اللہ عنہ ' عثمان رضی اللہ عنہ ' حکمران نہیں تھے یا یہ کہ قیصرو کسریٰ نے کبھی حکومت نہیں کی۔

یہ "خلفاء" معصوم نہ تھے

رہا یہ مسئلہ کہ یزید' عبدالملک ' منصور وغیرہ خلفاء نیک تھے یا بد؟ صالح تھے یا فاجر؟ تو علماء اہل سنت نہ انہیں معصوم

سمجھتے ہیں نہ ان کے تمام احکام و اعمال کو عدل و انصاف قرار دیتے ہیں اور نہ ہر بات میں ان کی اطاعت واجب تصور کرتے ہیں۔ البتہ اہل سنت والجماعت کا یہ خیال ضرور ہے کہ عبادات و طاعت کے بہت سے کام ایسے ہیں جن میں ہمیں ان کی ضرورت ہے۔ مثلاً یہ کہ ان کے پیچھے جمعہ و عیدین کی نمازیں قائم کی جاتی ہیں۔ ان کے ساتھ کفار پر جہاد کیا جاتا ہے امربالمعروف و نہی عن المنکر اور حدود شرعیہ کے قیام میں ان سے مدد ملتی ہے نیز اسی نوع کے دوسرے معاملات ہیں' اگر حکام نہ ہوں تو ان اعمال کا ضائع ہو جانا اغلب ہے بلکہ ان میں سے بعض کا موجود ہونا ہی غیر ممکن ہے۔

نصب امام کے چند اصول

اہل سنت کے اس طریقہ پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ اعمال صالحہ انجام دینے میں اگر نیکوں کے ساتھ برے بھی شامل ہوں تو اس سے نیکوں کے عمل کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ بلاشبہ یہ بالکل درست ہے کہ اگر عادل صالح امام کا نصب ممکن ہو تو فاجر و مبتدع شخص کو امام بنانا جائز نہیں' اہل سنت کا بھی یہی مذہب ہے لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو بلکہ امامت کے دونوں مدعی فاجر اور مبتدع ہوں تو ظاہر ہے کہ حدود شرعیہ و عبادات دینیہ کے قیام کے لیے دونوں میں سے زیادہ اہلیت و قابلیت والے کو منتخب کیا جائے گا۔ ایک تیسری صورت بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی ایسا شخص موجود ہو جو صالح ہو مگر سپہ سالاری کے فرائض و واجبات ادا کرنے کا اہل نہ ہو۔ اس کے خلاف ایک فاجر شخص ہو جو بہترین طریق پر فوجوں کی قیادت کر سکتا ہو تو جس حد تک جنگی مقاصد کا تعلق ہے' یقیناً اسی آخرالذکر یعنی فاجر کو سربراہ بنانا پڑے گا۔ نیکی کے کاموں میں اس کی اطاعت و امداد کی جائے گی۔ بدی اور برائی میں اس پر اعتراض و انکار کیا جائے گا۔

حفظ مصالح اور دفع مفاسد

غرض امت کی مصلحتوں کا لحاظ مقدم ہے اگر کسی فعل میں بھلائی اور برائی دونوں موجود ہوں تو دیکھا جائے گا کہ کس کا پلہ بھاری ہے اگر بھلائی زیادہ نظر آئے تو اس فعل کو پسند کیا جائے گا۔ اگر برائی غالب دکھائی دے تو اس کے ترک کو ترجیح دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو اس لیے مبعوث

فرمایا تھا کہ مصالح کی تائید و تکمیل فرمائیں اور مفاسد مٹائیں یا کم کریں۔ یزید' عبدالملک اور منصور جیسے خلفاء کی اطاعت اسی لیے کی گئی کہ ان کی مخالفت میں امت کے لیے نقصان' نفع سے زیادہ تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان خلفاء پر جن لوگوں نے خروج کیا ان سے امت کو سراسر نقصان ہی پہنچا' نفع ذرا بھی نہیں ہوا۔ بلاشبہ ان خروج کرنے والوں میں بڑے بڑے اخیار و فضلاء بھی شامل تھے مگر ان کی نیکی و خوبی سے ان کا یہ فعل لازماً مفید نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے اپنے خروج سے نہ دین کو فائدہ پہنچایا اور نہ دنیوی نفع ہی حاصل کیا۔ اور معلوم رہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے فعل کا حکم نہیں دیتا جس میں نہ دنیا کا بھلا ہو نہ دین کا۔ جن لوگوں نے خروج کیا ان سے کہیں زیادہ افضل حضرت علی رضی اللہ عنہ' طلحہ رضی اللہ عنہ' زبیر رضی اللہ عنہ۔ عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرہم صحابہ تھے مگر خود انہوں نے اپنی خونریزی پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

عہد فتن میں خروج کی ممانعت

یہی وجہ ہے کہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ۔ حجاج بن یوسف ثقفی کے خلاف بغاوت سے روکتے تھے اور کہتے تھے "حجاج اللہ کا عذاب ہے اسے اپنے ہاتھوں کے زور سے دور کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ اللہ کے سامنے تضرع و زاری کرو کیونکہ اس نے فرمایا ہے:

﴿ وَلَقَدْ أَخَذْنَٰهُم بِٱلْعَذَابِ فَمَا ٱسْتَكَانُوا۟ لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُونَ ﴿٧٦﴾ ﴾

(المؤمنون ٢٣/ ٧٦)

"ہم نے ان کی عذاب کے ذریعے گرفت کی۔ انہوں نے پھر بھی اپنے رب کے سامنے نہ عاجزی کا اظہار کیا اور نہ اس کے حضور گڑگڑائے۔"

اسی طرح اور اخیار و ابرار بھی خلفاء پر خروج اور عہد فتنہ میں جنگ سے منع کیا کرتے تھے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ' سعید بن المسیب' حضرت زین العابدین۔ علی بن حسین وغیرہم اکابر صحابہ و تابعین جنگ حرہ کے زمانے میں یزید کے خلاف بغاوت کرنے سے روکتے تھے۔ احادیث صحیحہ بھی اسی مسلک کی مؤید ہیں اسی لیے اہلسنت کے نزدیک یہ تقریباً متفق علیہ مسئلہ ہے کہ عہد فتن میں قتال و جدال سے اجتناب اور جور ائمہ پر صبر کیا جائے' وہ یہ مسئلہ اپنے عقائد میں بھی ذکر کرتے رہے ہیں اور جو شخص متعلقہ احادیث اور اہل سنت

کے صاحب بصیرت علماء کے طرز عمل و فکر میں تامل کرے گا اس پر اس مسلک کی صحت و صداقت بالکل واضح ہو جائے گی۔

حضرت حسین کا عزم عراق

اسی لیے جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے عراق جانے کا ارادہ کیا تو اکابر اہل علم و تقوی مثلاً عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ۔ ابوبکر بن عبدالرحمن بن حارث رضی اللہ عنہ نے ان سے بہ منت کہا کہ وہاں نہ جائیں کیونکہ وہ سمجھتے تھے آپ ضرور شہید ہو جائیں گے۔ حتی کہ روانگی کے وقت بعضوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اَسْتَوْدِعُكَ اللّٰهَ مِنْ قَتِيْلٍ "اے شہید! ہم تجھے اللہ کو سونپتے ہیں۔"

اور بعضوں نے کہا:

«لَوْلَا الشَّنَاعَةُ لَأَمْسَكْتُكَ وَمَنَعْتُكَ مِنَ الْخُرُوْجِ»

"اگر بے ادبی نہ ہوتی تو ہم آپ کو زبردستی پکڑ لیتے اور ہرگز جانے نہ دیتے۔"

اس مشورے سے ان لوگوں کے مد نظر صرف آپ کی خیر خواہی اور مسلمانوں کی مصلحت تھی مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے ارادے پر قائم رہے۔ آدمی کی رائے کبھی درست ہوتی ہے اور کبھی غلط ہو جاتی ہے۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو عراق جانے سے روکنے والوں ہی کی رائے درست تھی کیونکہ آپ کے جانے سے ہرگز کوئی دینی یا دنیاوی مصلحت حاصل نہ ہوئی بلکہ یہ مضرت پیدا ہوئی کہ سرکشوں اور ظالموں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جگر گوشے پر قابو مل گیا اور وہ مظلوم شہید کر دیئے گئے۔ آپ کے جانے اور پھر قتل سے جتنے مفاسد پیدا ہوئے وہ ہرگز واقع نہ ہوتے اگر آپ اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے کیونکہ جس خیر و صلاح کے قیام اور شر و فساد کے دفعیہ کے لیے آپ اٹھے تھے اس میں سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ برعکس اس کے شر کو غلبہ اور عروج حاصل ہو گیا۔ خیر و صلاح میں کمی آ گئی اور ایک بہت بڑے دائمی فتنے کا دروازہ کھل گیا جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے فتنے پھیلے اسی طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت نے بھی فتنوں کے سیلاب بہا دیئے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مقام بلند

اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ کا ائمہ و خلفاء کے ظلم پر صبر کرنے اور ان سے جنگ و بغاوت نہ کرنے کا حکم مناسب اور امت کے دین و دنیا کے لیے زیادہ بہتر تھا اور جنہوں نے بالقصد یا بلا قصد اس کی مخالفت کی۔ ان کے فعل سے امت کو فائدہ کے بجائے نقصان ہی پہنچا۔ یہی سبب ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی تعریف میں فرمایا تھا:

«إِنَّ ابْنِي هٰذَا سَيِّدٌ وَّلَعَلَّ اللهِ أَنْ يُّصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيْمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ»(صحيح البخاري، الصلح، ح: ٢٧٠٤)

"میرا یہ فرزند سردار ہے عنقریب خدا اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا۔"

لیکن اس بات پر کسی شخص کی بھی تعریف نہیں کی کہ وہ فتنہ میں پڑے گا یا خلفاء پر خروج کرے گا یا اطاعت سے برگشتہ یا جماعت سے منحرف ہو گا۔ اس حدیث سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دو گروہوں میں صلح کرانا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نظر میں مستحسن و محبوب ہے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا خلافت سے دستبردار ہو کر مسلمانوں کی خونریزی کا خاتمہ کر دینا ان کے فضائل میں ایک عظیم ترین فضیلت ہے کیونکہ اگر خانہ جنگی واجب و مستحب ہوتی تو آنحضرت ﷺ اس کے ترک پر ہرگز تعریف نہ فرماتے۔

یہاں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ نبی ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو ایک ساتھ گود میں لے کر فرمایا کرتے تھے۔ "اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی محبت کر۔" چنانچہ جس طرح آپ اپنی محبت میں دونوں کو یکساں شریک کرتے تھے اسی طرح بعد میں یہ دونوں ان خانہ جنگیوں سے یکساں طور پر نفرت کرتے تھے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ تو جنگ صفین کے دن اپنے گھر بیٹھ رہے تھے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ ہمیشہ اپنے پدر و برادر (حضرت علی اور حسین رضی اللہ عنہما) کو جنگ سے باز رہنے کا مشورہ دیتے تھے۔ پھر جب خود با اختیار ہوئے تو جنگ سے دستبردار ہو گئے اور لڑنے والوں میں صلح قائم کر دی۔ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بھی آخر میں یہ حقیقت روشن ہو گئی تھی کہ جنگ

کے جاری رہنے سے زیادہ اس کے ختم ہو جانے میں مصلحت ہے۔ پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی کربلا پہنچ کر جنگ سے بیزار اور سرے سے دعویٰ امارت و خلافت ہی سے دستبردار ہو گئے تھے اور کہتے تھے "مجھے وطن لوٹ جانے دو۔"

اطاعت فی المعروف

اب یہ بات صاف ہو گئی کہ یزید کا معاملہ کوئی خاص جداگانہ معاملہ نہیں بلکہ دوسرے مسلمان بادشاہوں کا سا معاملہ ہے یعنی جس کسی نے طاعت الٰہی مثلاً نماز' حج' جہاد' امربالمعروف و نہی عن المنکر اور اقامت حدود شرعیہ میں ان کی موافقت کی اسے اپنی اس نیکی اور اللہ و رسول کی فرمانبرداری پر ثواب ملے گا۔ چنانچہ اس زمانے کے صالح مومنین مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ کا یہی طریقہ تھا۔ لیکن جس نے ان بادشاہوں کے جھوٹ کی تصدیق کی' اور ان کے ظلم میں مددگار ہوا' وہ گناہ گار ہوا اور زجر و توبیخ اور مذمت اور سزا کا سزاوار۔ یہی باعث ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یزید وغیرہ امراء کی ماتحتی میں جہاد کو جاتے تھے۔ چنانچہ جب یزید نے اپنے باپ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں قسطنطنیہ کا غزوہ کیا تو اس کی فوج میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی شریک تھے۔ یہ مسلمانوں کی سب سے پہلی فوج ہے جس نے قسطنطنیہ کا غزوہ کیا [1] اور صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَوَّلُ جَيْشٍ مِّنْ أُمَّتِيْ يَغْزُوْنَ مَدِيْنَةَ قَيْصَرَ مَغْفُوْرٌ لَّهُمْ»(صحيح البخاري، الجهاد والسير، باب ما قيل في قتال الروم، ح:٢٩٢٤)

"جو فوج سب سے پہلے قسطنطنیہ کا غزوہ کرے گی وہ مغفور یعنی بخشی بخشائی ہے۔"

یزید کے بارے میں افراط و تفریط

اس تفصیل کے بعد اب ہم کہتے ہیں کہ یزید کے بارے میں لوگوں نے افراط و تفریط سے کام لیا ہے ایک گروہ تو اسے خلفائے راشدین اور انبیائے مقربین میں سے سمجھتا ہے اور یہ سراسر غلط

---

[1] یہ غزوہ ۵۱ھ میں ہوا جس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ یزید کی ماتحتی میں شریک تھے (البدایہ' ص:۱۵۱' ج:۸) ظاہر ہے اس اثناء میں نمازیں بھی یزید کے پیچھے پڑھتے رہے۔ (ص'ی)

ہے دوسرا گروہ اسے باطن میں کافر و منافق بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس نے قصداً حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا اور مدینہ میں قتل عام کرایا تاکہ اپنے ان رشتہ داروں کے خون کا انتقام لے جو بدر و خندق وغیرہ کی جنگوں میں بنی ہاشم اور انصار کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے اور یہ کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد اس نے یہ شعر پڑھے تھے۔

لَمَّا بَدَتْ تِلْكَ الْحَمُوْلُ وَأَشْرَفَتْ
تِلْكَ الرُّؤُوْسُ عَلٰى أَبِيْ جَيْرُوْنِ

"جب وہ سواریاں اور سرابو جیرون کی بلندیوں پر نمودار ہوئے۔"

نَعَقَ الْغُرَابُ فَقُلْتُ نَحَّ أَوْ لاَ تَنُحَّ
فَلَقَدْ قَضَيْتُ مِنَ النَّبِيِّ دُيُوْنِيْ

"تو کوا چلایا۔ اس پر میں نے کہا تو نوحہ کر یا نہ کر میں نے تو نبی سے اپنا قرض پورا پورا وصول کر لیا!؟"

یا یہ کہ اس نے کہا:

لَيْتَ أَشْيَاخِيْ بِبَدْرٍ شَهِدُوْا
جَزْعَ الْخَزْرَجِ مِنْ وَقْعِ الْأَسَلِ

"کاش میرے بدر والے بزرگ' نیزوں کی مار سے خزرج و انصار کی دہشت دیکھتے۔"

قَدْ قَتَلْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ سَادَاتِهِمْ
وَعَدَلْنَا بِبَدْرٍ فَاعْتَدَلِ

"ہم نے ان کے سرداروں میں چوٹی کے سردار قتل کر ڈالے اور اس طرح بدر کا بدلہ اتار دیا۔"

یہ تمام اقوال سراسر بہتان اور جھوٹ ہیں۔

حقیقت حال

حقیقت یہ ہے کہ یزید مسلمان بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ اور دنیا دار خلفاء میں سے ایک خلیفہ تھا۔ رہے حسین رضی اللہ عنہ تو بلاشبہ وہ اسی طرح مظلوم شہید ہوئے جس طرح اور بہت سے صالحین ظلم و قہر کے ہاتھوں جام شہادت پی چکے تھے۔

لاریب حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی معصیت اور نافرمانی ہے۔ اس سے وہ تمام لوگ آلودہ ہیں جنہوں نے آپ کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا یا قتل میں مدد کی یا قتل کو پسند کیا۔

شہادت کا رتبہ بلند

شہادت حسین رضی اللہ عنہ اگرچہ امت کے لیے بہت بڑی مصیبت ہے لیکن خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حق میں ہرگز مصیبت نہیں' بلکہ شہادت' عزت اور علو منزلت ہے۔ یہ سعادت بغیر مصائب و محن میں پڑے حاصل نہیں ہو سکتی چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں نواسے (حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ) گہوارۂ اسلام میں پیدا ہوئے' امن و امان کی گود میں پلے اور ہولناک مصائب سے دور رہے جن کے طوفانوں میں ان کے اہل بیت مردانہ وار تیرتے پھرتے تھے۔ اس لیے شہداء خوش بخت کے اعلیٰ درجاتِ منازل تک پہنچنے کے لیے انہیں کٹھن مرحلے سے گزرنا ضرور تھا۔ چنانچہ دونوں گزر گئے۔ ایک کو زہر دیا گیا اور دوسرے کے گلے پر چھری پھیری گئی۔

بڑی بڑی اہم شہادتیں

لیکن یہ بھی ملحوظ رہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قتل کسی حال میں بھی ان انبیاء (علیہم السلام) کے قتل سے زیادہ گناہ اور مصیبت نہیں جنہیں بنی اسرائیل قتل کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قتل بھی ان کے قتل سے زیادہ گناہ اور امت کے لیے زیادہ بڑی مصیبت تھا۔

صبر' نہ کہ جزع فزع

یہ حوادث کتنے ہی دردناک ہوں بہرحال ان پر صبر کرنا' اور ﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ﴾ کہنا چاہیئے کیونکہ اس سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ﴿١٥٥﴾ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿١٥٦﴾ ﴾ (البقرۃ ۲/ ۱۵۵۔۱۵۶)

"ان صبر گزاروں کو خوشخبری دے دیجئے جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو ان کی زبان پر ﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ﴾ جاری ہو جاتا ہے۔"

ماتم اور بین کرنے والے ہم میں سے نہیں

حدیث صحیح میں آیا ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَطَمَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُيُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب ليس منا...، ح: ١٢٩٤)

"جس نے منہ پیٹا گریبان چاک کیا اور جاہلیت کے بین کیے وہ ہم میں سے نہیں۔"

نیز نبی ﷺ نے صَالِقه ' حَالِقه اور شَاقَّه سے اپنے تئیں بری بتایا ہے:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ بَرِيءٌ مِنَ الصَّالِقَةِ وَالْحَالِقَةِ وَالشَّاقَّةِ»(صحيح البخاري، الجنائز، باب ما ينهى من الحلق عند المصيبة، ح: ١٢٩٦)

صالقه بین کرنے والی عورتیں" حالقه غم سے بال منڈا ڈالنے والی اور شاقّه گریبان پھاڑنے والی عورتیں۔

نیز فرمایا:

«اَلنَّائِحَةُ إِذَا لَمْ تَتُبْ قَبْلَ مَوْتِهَا تُقَامُ وَعَلَيْهَا سِرْبَالٌ مِّنْ قَطِرَانٍ، وَّدِرْعٌ مِّنْ جَرْبٍ»(صحيح مسلم، الجنائز، باب التشديد في النياحة، ح: ٩٣٤)

"نوحہ کرنے والی عورتیں اگر توبہ کے بغیر مرجائیں گی تو انہیں قیامت کے دن خارشی قمیص اور گندھک کا جامہ پہنا کر کھڑا کیا جائے گا۔"

اس قسم کی ایک عورت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لائی گئی تو آپ نے اسے مارنے کا حکم دیا۔ سزا کے دوران میں اس کا سر کھل گیا تو لوگوں نے عرض کیا۔ امیر المومنین اس کا سر برہنہ ہو گیا ہے۔ فرمایا کچھ پروا نہیں۔

«لاَ حُرْمَةَ لَهَا إِنَّهَا تَنْهٰى عَنِ الصَّبْرِ وَقَدْ أَمَرَ اللهُ بِهِ وَتَأْمُرُ بِالْجَزَعِ وَقَدْ نَهَى اللهُ عَنْهُ وَتَفْتِنُ الْحَيَّ وَتُؤْذِي الْمَيِّتَ وَتَبِيْعُ عَبْرَتَهَا وَتَبْكِيْ بِشَجْوِ غَيْرِهَا إِنَّهَا لاَ تَبْكِيْ عَلٰى مَيِّتِكُمْ إِنَّمَا تَبْكِيْ عَلٰى أَخْذِ دَرَاهِمِكُمْ»

"اس کی کوئی حرمت نہیں کیونکہ یہ لوگوں کو مصیبت میں صبر کرنے سے منع کرتی ہے حالانکہ اللہ نے صبر کا حکم دیا ہے' اور یہ رونے کی ترغیب دیتی ہے حالانکہ اللہ نے اس سے منع کیا ہے۔ زندہ کو فتنے میں ڈالتی ہے۔ مردہ کو تکلیف دیتی ہے۔ اپنے آنسو

فروخت کرتی ہے۔ اور دوسروں کے لیے بناوٹ سے روتی ہے یہ تمہاری میت پر نہیں روتی بلکہ تمہارا پیسہ لینے کے لیے آنسو بہاتی ہے۔"

شہادت حسین کے بارے میں افراط و تفریط

جس طرح لوگوں نے یزید کے بارے میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے اسی طرح بعضوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں بے اعتدالی برتی ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے۔ (معاذ اللہ!)

"ان کا قتل درست اور شریعت کے مطابق ہوا کیونکہ انہوں نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے اور جماعت کو توڑنے کی کوشش کی تھی اور جو ایسا کرے اس کا قتل واجب ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں:

«مَنْ أَتَاكُمْ وَأَمْرُكُمْ جَمِيعٌ، عَلٰى رَجُلٍ وَّاحِدٍ، يُرِيْدُ أَنْ يَّشُقَّ عَصَاكُمْ أَوْ يُفَرِّقَ جَمَاعَتَكُمْ فَاقْتُلُوْهُ»(صحيح مسلم، الإمارة، باب حكم من فرق أمر المسلمين وهو مجتمع، ح: ١٨٥٢)

"اتفاق کی صورت میں جو تم میں پھوٹ ڈالنے آئے اسے قتل کر ڈالو۔"

حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی پھوٹ ڈالنا چاہتے تھے اس لیے بجا طور پر قتل کر ڈالے گئے۔"

بلکہ بعضوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ "اسلام میں اولین باغی حسین ہے۔"

ان کے مقابلے میں دوسرا گروہ کہتا ہے:

"حضرت حسین امام برحق تھے ان کی اطاعت واجب تھی ان کے بغیر ایمان کا کوئی تقاضا بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ جماعت اور جمعہ اسی کے پیچھے درست ہے جسے انہوں نے مقرر کیا اور جہاد نہیں ہو سکتا جب تک ان کی طرف سے اجازت موجود نہ ہو۔"

مقابلے کا ارادہ ترک کر دیا

ان دونوں نہایت غلطیوں کے درمیان اہلسنّت ہیں وہ نہ پہلے گروہ کے ہمنوا ہیں اور نہ دوسرے گروہ کے۔ ان کا خیال ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مظلوم شہید کیے گئے ان کے ہاتھ امت کی سیاسی باگ ڈور نہیں آئی۔ علاوہ ازیں مذکورہ بالا احادیث ان پر چسپاں نہیں ہوتیں کیونکہ جب انہیں اپنے

بھائی مسلم بن عقیل کا انجام معلوم ہوا تو وہ اپنے اس ارادے سے دستبردار ہو گئے [۱] تھے اور فرماتے [۲] تھے۔

"مجھے وطن جانے دو یا کسی سرحد پر مسلمانوں کی فوج سے جا ملنے دو یا خود یزید کے پاس پہنچنے دو [۳] مگر مخالفین نے ان کی کوئی بات بھی نہ مانی اور اسیری قبول کرنے پر اصرار کیا جسے انہوں نے نامنظور کر دیا کیونکہ اسے منظور کرنا ان پر شرعاً واجب نہ تھا۔

---

[۱] یعنی راستے ہی سے واپس مکہ جانے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن مسلم کے بھائیوں کے اصرار کا ساتھ دینا پڑا جیساکہ شیعہ سنی سب تاریخوں میں ہے۔ (ص ' ی)

[۲] یعنی منزل مقصود پر پہنچ کر جب ابن زیاد کی فوج کے سربراہ عمر بن سعد سے گفتگوئے مصالحت کے سلسلے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے متن میں مذکور تین باتیں فرمائیں۔

[۳] اس تیسری بات کے بارے میں تاریخ طبری ۴/ ۲۹۳ میں یہ الفاظ ہیں:

«فأَضعَ يَدِيْ فِيْ يَدِهِ فَيَحْكُمُ فِيَّ مَا رأَىٰ»(البداية: ۸/ ۱۷۱)

"میں براہ راست یزید کے ہاتھ میں ہاتھ رکھ دوں گا (بیعت کر لوں گا) پھر وہ جیساکہ مناسب سمجھے کر لے گا۔"

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی ایک جگہ یہ الفاظ ذکر کیے ہیں:

«وَطَلَبَ أَنْ يَرُدُّوْهُ إِلٰى يَزِيْدِ ابْنِ عَمِّهِ حَتّٰى يَضَعَ يَدَهُ فِيْ يَدِهِ أَوْ يَرْجِعَ مِنْ حَيْثُ جَآءَ أَوْ يَلْحَقَ بَعْضَ الثُّغُوْرِ»(رأس الحسين، ص: ۲۰)

مطلب وہی ہے جو متن میں ہے۔ (ص ' ی)



شہادت حسین رضی اللہ عنہ کا نتیجہ

صحابہ سے بدگمانی اور بدعات محرم کا ظہور

شہادت حسین کی وجہ سے شیطان کو بدعتوں اور ضلالتوں کے پھیلانے کا موقعہ مل گیا۔ چنانچہ کچھ لوگ یوم عاشوراء میں نوحہ و ماتم کرتے ہیں' منہ پیٹتے ہیں' روتے چلاتے ہیں' بھوکے پیاسے رہتے ہیں' مرثیے پڑھتے ہیں' یہی نہیں بلکہ سلف و صحابہ رضی اللہ عنہم کو گالیاں دیتے ہیں' لعنت کرتے ہیں' اور ان بے گناہ لوگوں کو لپیٹ لیتے ہیں جنہیں واقعات شہادت سے دور و نزدیک کا کوئی تعلق نہ تھا بلکہ ﴿اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ﴾ کو بھی گالیاں دیتے ہیں پھر واقعۂ شہادت کی جو کتابیں پڑھتے ہیں وہ زیادہ تر اکاذیب و اباطیل کا مجموعہ ہیں اور ان کی تصنیف و اشاعت سے ان کے مصنفوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ فتنہ کے نئے نئے دروازے کھلیں۔ اور امت میں پھوٹ بڑھتی جائے۔ یہ چیز باتفاق جملہ اہل اسلام نہ واجب ہے نہ مستحب' بلکہ اس طرح رونا پیٹنا اور پرانی مصیبتوں پر گریہ و زاری کرنا اعظم ترین محرمات دینیہ میں سے ہے۔

پھر ان کے مقابلے میں دوسرا فرقہ ہے جو یوم عاشوراء میں مسرت اور خوشی کی بدعت کرتا ہے۔ کوفہ میں یہ دونوں گروہ موجود تھے۔ شیعوں کا سردار مختار بن عبید تھا اور ناصبیوں کا سرگروہ حجاج بن یوسف الثقفی تھا۔

واقعاتِ شہادت میں مبالغہ

جن لوگوں نے واقعاتِ شہادت قلم بند کیے ہیں ان میں اکثر نے بہت کچھ جھوٹ ملا دیا ہے۔ جس طرح شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ بیان کرنے والوں نے کیا اور جیسے مغازی و فتوحات کے راویوں کا حال ہے حتی کہ واقعاتِ شہادت کے مؤرخین میں سے بعض اہل علم مثلاً بغوی اور ابن ابی الدنیا وغیرہ بھی بے بنیاد روائتوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ رہے وہ مصنف جو بلااسناد واقعات روایت کرتے ہیں' تو ان کے ہاں جھوٹ بہت زیادہ ہے۔

دندان مبارک پر چھڑی مارنے کا واقعہ

صحیح طور پر صرف اس قدر ثابت ہے کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید کیے گئے تو آپ کا سر مبارک عبیداللہ بن زیاد کے سامنے لایا گیا۔ اس نے آپ کے دانتوں پر چھڑی ماری اور آپ کے حسن کی مذمت کی۔ مجلس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ دو صحابی موجود تھے انس رضی اللہ عنہ نے اس کی تردید کی اور کہا۔ "آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔" صرف حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی نہیں بلکہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی آپ کی شہادت سے ازحد ملال تھا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک عراقی نے پوچھا کہ حالت احرام میں مکھی کا مارنا جائز ہے؟ انہوں نے خفا ہو کر جواب دیا۔

"اے اہل عراق تمہیں مکھی کی جان کا اتنا خیال ہے حالانکہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے کو قتل کر چکے ہو۔"

بعض روائتوں میں دانتوں پر چھڑی مارنے کا واقعہ یزید کی طرف منسوب کیا گیا ہے جو بالکل غلط ہے کیونکہ جو صحابی اس واقعے میں موجود تھے وہ دمشق میں نہیں تھے عراق میں تھے۔

یزید نے حضرت حسین کے قتل کا حکم نہیں دیا

متعدد مؤرخین نے جو نقل کیا ہے وہ یہی ہے کہ یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم نہیں دیا اور نہ یہ بات ہی اس کے پیش نظر تھی بلکہ وہ تو اپنے باپ معاویہ رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق ان کی تعظیم و تکریم کرنا چاہتا تھا۔ البتہ اس کی یہ خواہش تھی کہ آپ خلافت کے مدعی ہو کر اس پر خروج نہ کریں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب کربلا پہنچے اور آپ کو اہل کوفہ کی بے وفائی کا یقین ہو گیا تو ہر طرح کے مطالبے سے دست بردار ہو گئے تھے۔ مگر مخالفوں نے نہ انہیں وطن واپس ہونے دیا' نہ جہاد پر جانے دیا اور نہ یزید کے پاس بھیجنے پر رضامند ہوئے بلکہ قید کرنا چاہا جسے آپ نے نامنظور کیا اور شہید ہو گئے۔ یزید اور اس کے خاندان کو جب یہ خبر پہنچی تو بہت رنجیدہ ہوئے اور روئے بلکہ یزید نے تو یہاں تک کہا۔

«قَبَّحَ اللهُ ابْنَ مَرْجَانَةَ لَوْ كَانَتْ بَيْنَهُ وَبَيْنَكُمْ رَحِمٌ أَوْ قَرَابَةٌ مَا فَعَلَ هٰذَا بِكُمْ»(تاريخ الطبري: ٤/ ٣٥٣ والبداية: ٨/ ١٩٣)

”عبیداللہ بن زیاد) پر اللہ کی پھٹکار! واللہ! اگر وہ خود حسین رضی اللہ عنہ کا رشتہ دار ہوتا تو ہرگز قتل نہ کرتا۔“

اور کہا:

«قَدْ كُنْتُ أَرْضٰى مِنْ طَاعَةِ أَهْلِ الْعِرَاقِ بِدُوْنِ قَتْلِ الْحُسَيْنِ»

”بغیر قتل حسین کے بھی میں اہل عراق کی اطاعت منظور کر سکتا تھا۔“

پھر اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پسماندگان کی بڑی خاطر تواضع کی اور عزت کے ساتھ انہیں مدینہ واپس پہنچا دیا۔

یزید نے اہل بیت کی بے حرمتی نہیں کی

بلاشبہ یہ بھی درست ہے کہ یزید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی طرفداری بھی نہیں کی' نہ ان کے قاتلوں کو قتل کیا نہ ان سے انتقام لیا۔ لیکن یہ کہنا بالکل سفید جھوٹ ہے کہ اس نے اہل بیت کی خواتین کو کنیز بنایا۔ ملک ملک پھرایا اور بغیر کجاوہ کے انہیں اونٹوں پر سوار کرایا۔ الحمدللہ مسلمانوں نے آج تک کسی ہاشمی عورت سے یہ سلوک نہیں کیا اور نہ اسے امت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کسی حال میں جائز رکھا ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کا گناہ عظیم

یہ بالکل درست ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت عظیم ترین گناہوں میں سے ایک گناہ تھی۔ جنہوں نے یہ فعل کیا' جنہوں نے اس میں مدد کی' جو اس سے خوش ہوئے وہ سب کے سب اس عتاب الٰہی کے سزاوار ہیں جو ایسے لوگوں کے لیے شریعت میں وارد ہے لیکن حسین رضی اللہ عنہ کا قتل ان لوگوں کے قتل سے بڑھ کر نہیں جو ان سے افضل تھے۔ مثلاً انبیاء علیہم السلام مومنین اولین' شہداء یمامہ' شہداء اُحد' شہداء بئر معونہ۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا خود حضرت علی رضی اللہ عنہ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قاتل تو آپ کو کافر و مرتد سمجھتے اور یقین کرتے تھے کہ آپ کا قتل عظیم ترین عبادت ہے۔

برخلاف حسین رضی اللہ عنہ کے کہ ان کے قاتل انہیں ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ ان میں اکثر تو آپ کے قتل کو ناپسند کرتے اور ایک بڑا گناہ تصور کرتے تھے لیکن اپنی اغراض کی خاطر اس فعل شنیع کے مرتکب ہوئے جیسا کہ لوگ سلطنت کے لیے باہمی خونریزی کرتے ہیں۔

یزید پر لعنت بھیجنے کا مسئلہ

رہا سوال یزید پر لعنت کرنے کا تو واقعہ یہ ہے کہ یزید بھی بہت سے دوسرے بادشاہوں اور خلفاء جیسا ہی ہے بلکہ کئی حکمرانوں سے وہ اچھا تھا۔ وہ عراق کے امیر "مختار بن ابی عبید الثقفی" سے کہیں اچھا تھا۔ جس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی حمایت کا علم بلند کیا۔ ان کے قاتلوں سے انتقام لیا مگر ساتھ ساتھ یہ دعویٰ کیا کہ جبرائیل اس کے پاس آتے ہیں، اسی طرح یزید حجاج بن یوسف سے اچھا تھا جو بلا نزاع یزید سے کہیں زیادہ ظالم تھا۔ یزید اور اس جیسے دوسرے سلاطین و خلفاء کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فاسق تھے۔

لعنت کے بارے میں مسئلہ شرعیہ

لیکن کسی فاسق کو معین کر کے لعنت کرنا سنت نبوی میں موجود نہیں البتہ عام لعنت وارد ہے۔

مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَعَنَ اللهُ السَّارِقَ يَسْرِقُ الْبَيْضَةَ فَتُقْطَعُ يَدُهُ»(صحيح بخاري، الحدود، باب لعن السارق إذا لم يسم، ح:٦٧٨٣ وصحيح مسلم، الحدود، باب حد السرقة ونصابها، ح:١٦٨٧)

"چور پر اللہ کی لعنت کہ ایک انڈے پر اپنا ہاتھ کٹوا دیتا ہے۔"

فرمایا:

«فَمَنْ أَحْدَثَ حَدَثًا أَوْ آوٰى مُحْدِثًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللهِ»
(صحيح البخاري، الجزية والموادعة، باب إثم من عاهد ثم غدر، ح:٣١٧٩)

"جو بدعت نکالے یا بدعتی کو پناہ دے اس پر اللہ کی لعنت۔"

یا مثلاً صحیح بخاری میں ہے کہ ایک شخص شراب پیتا تھا اور بار بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پکڑا آتا تھا یہاں تک کہ کئی پھیرے ہو چکے تو ایک شخص نے کہا:

«اَللّٰهُمَّ الْعَنْهُ مَا أَكْثَرَ مَا يُؤْتٰى بِهِ»

"اس پر اللہ کی لعنت کہ بار بار پکڑ کر دربار رسالت میں پیش کیا جاتا ہے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا:

«لَا تَلْعَنُوْهُ فَوَاللّٰهِ مَا عَلِمْتُ، أَنَّهُ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ»

(صحيح البخاري، الحدود، باب ما يكره من لعن شارب الخمر . . . ، ح: ٦٧٨٠)

"اسے لعنت نہ کرو۔ کیونکہ یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے۔"

حالانکہ آپ نے عام طور پر شرابیوں پر لعنت بھیجی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ عام طور پر کسی خاص گروہ پر لعنت بھیجنا جائز ہے مگر اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنے والے کسی معین شخص پر لعنت کرنا جائز نہیں اور معلوم ہے کہ ہر مومن اللہ اور رسول سے ضرور محبت رکھتا ہے۔

یزید پر لعنت سے پہلے دو چیزوں کا اثبات ضروری ہے

صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو گا وہ بالآخر دوزخ سے نجات پائے گا۔

بنابریں جو لوگ یزید کی لعنت پر زور دیتے ہیں انہیں دو باتیں ثابت کرنی چاہئیں۔ اول یہ کہ یزید ایسے فاسقوں اور ظالموں میں سے تھا جن پر لعنت کرنا مباح ہے۔ اور اپنی اس حالت پر موت تک رہا۔ دوسرے یہ کہ ایسے ظالموں اور فاسقوں میں سے کسی ایک کو معین کر کے لعنت کرنا روا ہے۔ رہی آیت ﴿ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (هود :١١/١٨) تو یہ عام ہے جیسا کہ باقی تمام آیات وعید عام ہیں۔ اور پھر ان آیتوں سے کیا ثابت ہوتا ہے یہی کہ یہ گناہ لعنت اور عذاب کا مستوجب ہے؟ لیکن بسااوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرے اسباب آ کر لعنت و عذاب کے اسباب کو دور کر دیتے ہیں مثلاً گناہ گار نے سچے دل سے توبہ کر لی یا اس سے ایسی حسنات بن آئیں جو سیئات کو مٹا دیتی ہیں۔ یا ایسے مصائب پیش آئے جو گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔ بنابریں کون شخص دعویٰ کر سکتا ہے کہ یزید اور اس جیسے بادشاہوں نے توبہ نہیں کی' یا سیئات کو دور کرنے والی حسنات انجام نہیں دیں یا گناہوں کا

کفارہ ادا نہیں کیا' یا یہ کہ اللہ کسی حال میں بھی انہیں نہیں بخشے گا۔ حالانکہ وہ خود فرماتا ہے:

﴿ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِۦ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَآءُ ﴾ (النساء٤/ ٤٨)

پھر صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''سب سے پہلے قسطنطنیہ پر جو فوج لڑے گی وہ مغفور ہے۔'' (صحیح البخاری' الجهاد والسیر' باب ماقیل فی قتال الروم' ح:2924)

اور معلوم ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے جس فوج نے قسطنطنیہ پر لڑائی کی اس کا سپہ سالار یزید ہی تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یزید نے یہ حدیث سن کر ہی فوج کشی کی ہوگی' بہت ممکن ہے کہ یہ بھی صحیح ہو لیکن اس سے اس فعل پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی جا سکتی۔

لعنت کا دروازہ کھولنے کے نتائج

پھر ہم خوب جانتے ہیں کہ اکثر مسلمان کسی نہ کسی طرح کے ظلم سے ضرور آلودہ ہوتے ہیں اگر لعنت کا دروازہ اس طرح کھول دیا جائے تو مسلمانوں کے اکثر مردے لعنت کا شکار ہو جائیں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مردہ کے حق میں صلاۃ و دعا کا حکم دیا ہے نہ کہ لعنت کرنے کا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«لاَ تَسُبُّوا الأَمْوَاتَ فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضَوْا إِلٰى مَا قَدَّمُوْا»(صحيح البخاري، الجنائز، باب ما ينهى من سب الأموات، ح:١٣٩٣)

''مردوں کو گالی مت دو کیونکہ وہ اپنے کیے کو پہنچ گئے۔''

بلکہ جب لوگوں نے ابوجہل جیسے کفار کو گالیاں دینی شروع کیں تو انہیں منع کیا اور فرمایا:

«لاَ تَسُبُّوْا مَوْتَانَا فَتُؤْذُوْا أَحْيَاءَنَا»

(سنن النسائي، القسامة، القود من اللطمة، ح:٤٧٧٩)

''ہمارے مرے ہوؤں کو گالیاں مت دو کیونکہ اس سے ہمارے زندوں کو تکلیف ہوتی ہے۔''

یہ اس لیے کہ قدرتی طور پر ان کے مسلمان رشتہ دار برا مانتے تھے۔ امام احمد بن حنبل

رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے بیٹے صالح نے کہا اَلاَ تَلْعَنُ یَزِیدَ؟ آپ یزید پر لعنت کیوں نہیں کرتے؟ حضرت امام نے جواب دیا: مَتٰی رَاَیتَ اَبَاكَ یَلْعَنُ اَحَداً "تو نے اپنے باپ کو کسی پر بھی لعنت کرتے کب دیکھا تھا۔"

قرآن کریم کی آیت:

﴿ فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِن تَوَلَّيْتُمْ أَن تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ﴿٢٢﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ ﴿٢٣﴾﴾ (محمد ٤٧/ ٢٢-٢٣)

"کیا تم سے بعید ہے کہ اگر جہاد سے پیٹھ پھیرلو تو لگو ملک میں فساد کرنے اور اپنے رشتے توڑنے یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کو بہرا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔"

سے خاص یزید کی لعنت پر اصرار کرنا خلاف انصاف ہے۔ کیونکہ یہ آیت عام ہے اور اس کی وعید ان تمام لوگوں کو شامل ہے جو ایسے افعال کے مرتکب ہوں جن کا اس آیت میں ذکر ہے یہ افعال صرف یزید ہی نے نہیں کیے بلکہ بہت سے ہاشمی' عباسی' علوی بھی ان کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اگر اس آیت کی رو سے ان سب پر لعنت کرنا ضروری ہو تو اکثر مسلمانوں پر لعنت ضروری ہو جائے گی۔ کیوں کہ یہ افعال بہت عام ہیں مگر یہ فتوی کوئی بھی نہیں دے سکتا۔

قاتلین حسین کے متعلق روایات

رہی وہ روایت جو بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "حسین کا قاتل آگ کے تابوت میں ہو گا۔ اس اکیلے پر آدھی دوزخ کا عذاب ہو گا اس کے ہاتھ پاؤں آتشی زنجیروں سے جکڑے ہوں گے وہ دوزخ میں الٹا اتارا جائے گا یہاں تک کہ اس کی تہ تک پہنچ جائے گا اور اس میں اتنی سخت بدبو ہو گی کہ دوزخی تک اللہ سے پناہ مانگیں گے وہ ہمیشہ دوزخ میں پڑا جلتا رہے گا۔"

تو یہ روایت بالکل جھوٹی ہے اور ان لوگوں کی بنائی ہوئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تہمت باندھنے سے نہیں شرماتے۔ کہاں آدھی دوزخ کا عذاب' اور کہاں ایک حقیر آدمی؟

فرعون اور دوسرے کفار و منافقین، قاتلین انبیاء اور قاتلین مومنین اولین کا عذاب قاتلین حسین رضی اللہ عنہ سے کہیں زیادہ سخت ہو گا بلکہ عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کا گناہ بھی حسین رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے زیادہ ہے۔

اہل سنت کا مسلک معتدل

حسین رضی اللہ عنہ کی طرفداری میں اس غلو کا جواب ناصبیوں کا غُلو ہے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اس حدیث کا مصداق قرار دے کر

«فَمَنْ أَرَادَ أَنْ يُفَرِّقَ أَمْرَ هٰذِهِ الأُمَّةِ، وَهِيَ جَمِيْعٌ، فَاضْرِبُوْهُ بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَّنْ كَانَ»(صحيح مسلم، الإمارة، باب حكم من فرق أمر المسلمين وهو مجتمع، ح: ۱۸۵۲)

انہیں باغی اور واجب القتل قرار دیتے ہیں۔ لیکن اہل سنت والجماعت نہ اس کا ساتھ دیتے ہیں نہ اس غلو کا۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مظلوم شہید ہوئے اور ان کے قاتل ظالم و سرکش تھے۔ اور ان احادیث کا اطلاق ان پر صحیح نہیں جن میں تفریق بین المسلمین کرنے والے کے قتل کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ کربلا میں آپ کا قصد امت میں پھوٹ ڈالنا نہ تھا، بلکہ آپ جماعت ہی میں رہنا چاہتے تھے مگر ظالموں نے آپ کا کوئی مطالبہ نہ مانا، نہ آپ کو وطن واپس ہونے دیا، نہ سرحد پر جانے دیا۔ نہ خود یزید کے پاس پہنچنے دیا بلکہ قید کرنے پر اصرار کیا۔ ایک معمولی مسلمان بھی اس برتاؤ کا مستحق نہیں ہو سکتا کجا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ۔

اسی طرح یہ روایت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سفید جھوٹ ہے:

"جس نے میرے اہل بیت کا خون بہایا اور میرے خاندان کو اذیت دے کر مجھے تکلیف پہنچائی اس پر اللہ کا اور میرا غصہ سخت ہو گا۔"

اس طرح کی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کہیں نہیں نکل سکتی تھی۔ کیونکہ رشتہ داری اور قرابت سے زیادہ ایمان اور تقوی کی حرمت ہے اگر اہل بیت میں سے کوئی ایسا شخص جرم کرے جس پر شرعاً اس کا قتل واجب ہو تو بالاتفاق اسے قتل کر ڈالا

جائے گا۔ مثلاً اگر کوئی ہاشمی چوری کرے تو یقیناً اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اگر زنا کا مرتکب ہو تو سنگسار کر دیا جائے گا۔ اگر جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو قتل کر ڈالے تو قصاص میں اس کی بھی گردن ماری جائے گی۔ اگرچہ مقتول حبشی، رومی، ترکی دیلمی غرض کوئی ہو۔ کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«اَلْمُسْلِمُوْنَ تَتَكَافَأُ دِمَآؤُهُمْ»

(سنن أبي داؤد، الجهاد، باب في السرية ....، ح:٢٧٥١)

"یعنی تمام مسلمانوں کا خون یکساں حرمت رکھتا ہے۔"

پس ہاشمی وغیر ہاشمی کا خون برابر ہے۔

اسلامی مساوات

نیز فرمایا:

«إِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِيْنَ قَبْلَكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوْا إِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الشَّرِيْفُ تَرَكُوْهُ، وَإِذَا سَرَقَ فِيْهِمُ الضَّعِيْفُ أَقَامُوْا عَلَيْهِ الْحَدَّ وَأَيْمُ اللهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا»(صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب:٥٤، ح:٣٤٧٥ وصحيح مسلم، الحدود، باب قطع السارق الشريف وغيره ....، ح:١٦٨٨)

"اگلی قومیں اس طرح ہلاک ہوئیں کہ جب ان میں کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ لیکن جب معمولی آدمی جرم کرتا تو اسے سزا دی جاتی تھی۔ واللہ! اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی چوری کرے تو میں اس کا ہاتھ کاٹ ڈالوں گا۔"

اس میں نبی ﷺ نے تشریح کر دی ہے کہ اگر آپ کا قریب سے قریب عزیز بھی جرم سے آلودہ ہو گا تو اسے شرعی سزا ضرور ملے گی۔

کسی خاندان کی خصوصیت ثابت نہیں

پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ نبی ﷺ یہ کہہ کر اپنے خاندان کو خصوصیت دیں کہ جو ان کا خون بہائے گا۔ اس پر اللہ کا غصہ بھڑکے گا۔ کیونکہ یہ بات پہلے ہی مسلم ہے کہ ناحق قتل شریعت میں حرام ہے، عام اس سے کہ ہاشمی کا ہو یا غیر ہاشمی کا:

﴿ وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُۥ جَهَنَّمُ خَٰلِدًا فِيهَا وَغَضِبَ ٱللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُۥ وَأَعَدَّ لَهُۥ عَذَابًا عَظِيمًا ﴿٩٣﴾ ﴾

(النساء ٤/ ٩٣)

پس قتل کی اباحت و حرمت میں ہاشمی و غیر ہاشمی' سب مسلمان یکساں درجہ رکھتے ہیں۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دینا حرام ہے عام اس سے کہ آپ کے خاندان کو تکلیف دے کر ہو یا امت کو ستا کر' یا سنت کو توڑ کر۔ اب واضح ہو گیا کہ اس طرح کی بے بنیاد حدیثیں جاہلوں اور منافقوں کے سوا کوئی اور نہیں بیان کر سکتا۔

اسی طرح یہ کہنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ سے نیک سلوک کی مسلمانوں کو ہمیشہ وصیت کرتے اور فرماتے تھے۔ "یہ تمہارے پاس میری امانت ہیں" بالکل غلط ہے۔

بلاشبہ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما اہل بیت میں بڑا درجہ رکھتے ہیں لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کبھی نہیں فرمایا کہ "حسنین تمہارے پاس میری امانت ہیں۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے کہ اپنی اولاد مخلوق کو سونپیں۔

ایسا کہنے کے دو ہی مطلب ہو سکتے ہیں۔

① یہ کہ جس طرح مال امانت رکھا جاتا ہے اور اس کی حفاظت مقصود ہوتی ہے تو یہ صورت تو ہو نہیں سکتی کیونکہ مال کی طرح آدمی امانت رکھے نہیں جا سکتے۔

② یا یہ مطلب ہو گا کہ جس طرح بچوں کو مربیوں کے سپرد کیا جاتا ہے۔ تو یہ صورت بھی یہاں درست نہیں ہو سکتی کیونکہ بچپن میں حسنین اپنے والدین کی گود میں تھے۔ اور جب بالغ ہوئے تو اور سب آدمیوں کی طرح خود مختار اور اپنے ذمہ دار ہو گئے۔

اگر یہ مطلب بیان کیا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ان کی حفاظت و حراست کا حکم دیا تھا تو یہ بھی درست نہیں کیونکہ امت کسی کو مصیبت سے بچا نہیں سکتی۔ وہ صرف اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی حفاظت کرتا ہے۔

اگر کہا جائے کہ اس سے آپ کی غرض ان کی حمایت و نصرت تھی۔ تو اس میں ان کی

خصوصیت نہیں۔ ہر مسلمان کو دوسرے مظلوم مسلمان کی حمایت و نصرت کرنی چاہیئے اور ظاہر ہے حسنین رضی اللہ عنہما اس کے زیادہ مستحق ہیں۔

اسی طرح یہ کہنا کہ آیت:

﴿ قُل لَّآ أَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ أَجۡرًا إِلَّا ٱلۡمَوَدَّةَ فِي ٱلۡقُرۡبَىٰۗ ﴾ (الشوری ۴۲/ ۲۳)

''میں تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگتا ہوں صرف رشتہ داری کی محبت چاہتا ہوں۔''

حسنین رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی ہے' بالکل جھوٹ ہے کیونکہ یہ آیت سورۂ شوریٰ کی ہے اور سورۂ شوریٰ مکی ہے اور حسنین رضی اللہ عنہما کیا معنی؟ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی سے بھی پہلے اتری ہے۔ آپ کا عقد ہجرت کے دوسرے سال مدینہ میں ہوا اور حسن و حسین رضی اللہ عنہما ہجرت کے تیسرے اور چوتھے سال پیدا ہوئے۔ پھر یہ کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی ہے؟ (منہاج السنہ از صفحہ: ۲۴۷ تا ۲۵۶' ج:۲' طبع قدیم)



-- II --

سانحۂ کربلا

پس منظر اور اہم اسباب

سانحۂ کربلا کے سلسلے میں جو تفصیلات گزشتہ صفحات میں مذکور ہوئیں' ان سے اگرچہ اس سانحۂ الیمہ کی اصل حقیقت واضح ہو جاتی ہے' تاہم پھر بھی مختصراً اس کی ضروری روداد اور تھوڑا سا پس منظر بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے' ان چند مزید اشارات سے حقائق و واقعات کی تہ تک پہنچنا مزید آسان ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ العزیز۔

① حضرت حسین و یزید کی اس آویزش میں' سب سے پہلا نکتہ یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ ان دونوں کے گرامی قدر والدین (حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما) کے مابین بھی سیاسی آویزش اس حد تک رہی کہ مسلمان اس کی وجہ سے ۵ سال (۳۶ھ سے ۴۰ھ) تک خانہ جنگی کا شکار رہے اور جَمَل و صِفِّین کی خونی جنگوں سے تاریخ اسلام کے صفحات رنگین ہوئے۔

② اسے محض اقتدار کی رسہ کشی تو قرار دینا نہایت نامناسب اور احترام صحابیت کے تقاضوں کے خلاف ہے' تاہم یہ تاریخی حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ یہ دونوں جلیل القدر صحابی اپنے اپنے علاقوں اور دائروں میں بااختیار اور بااقتدار تھے۔ ایک امیرالمؤمنین تھے تو دوسرے' حضرت علی کے خلیفہ بننے کے وقت تک' شام کی گورنری پر ۱۵ سال سے مقرر اور فائز' گو ان کے یہ دونوں عہدے متفق علیہ نہ تھے۔ حضرت علی کے امیرالمؤمنین ہونے پر تمام مسلمان اس طرح متفق نہ ہو سکے تھے' جیسے وہ اس سے پہلے خلفائے ثلاثہ کی خلافت پر متفق ہوئے تھے (جیسا کہ شاہ ولی اللہ اور امام ابن تیمیہ وغیرہ محققین نے اس کی صراحت کی ہے' جس کی تفصیلات راقم کی کتاب "خلافت و ملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت" میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔) اسی طرح حضرت معاویہ کی گورنری کو حضرت علی نے

خلیفہ بننے کے بعد قبول نہیں کیا۔ لیکن دونوں' اتنے بااختیار اور ہمہ مقتدر ضرور تھے کہ دونوں کے ساتھ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد تھی جس کی وجہ سے دونوں کے سیاسی اختلافات باہم معرکہ آرائی اور خانہ جنگی پر منتج ہوئے۔

(۳) ہمہ مقتدر اور بااثر شخصیات کے باہمی اختلاف و مناقشہ کے' ان کے بعد آنے والے اخلاف پر' دو قسم کے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ کچھ تو اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ اختلافات سے سوائے نقصان اور مزید بربادی کے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ چنانچہ وہ صلح جوئی کی پالیسی اختیار اور مقابلہ آرائی سے گریز کرتے ہیں۔

اور بعض بوجوہ اسی اختلاف اور مقابلہ آرائی پر گامزن رہتے ہیں۔ اس کے کئی اسباب و وجوہ ہوتے ہیں' مثلاً اپنے حق پر یا برتر ہونے کا احساس۔ یا ان کے ساتھیوں کا اسی راہ کو اختیار کرنے پر اصرار یا بدخواہوں کا حمائتیوں کے روپ میں اپنے مفادات یا مقاصد کے حصول کے لیے انہیں استعمال کرنے کی کوشش کرنا' وغیرہ۔

اس نقطہ نظر سے جب ہم اس سانحے کے پس منظر کو دیکھتے ہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اخلاف (اولاد) میں مذکورہ دونوں قسم کے اثرات نظر آتے ہیں۔

(۴) حضرت حسن رضی اللہ عنہ اختلاف کی بجائے صلح کو پسند کرنے والے ہیں۔ حضرت حسن کی صلح جویانہ طبیعت کا تو یہ حال تھا کہ انہوں نے اپنے والد محترم سے ان کی زندگی میں بھی ان کی مقابلہ آرائی کی پالیسی سے اختلاف کیا اور انہیں حضرت معاویہ سے صلح کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ منقول ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے لڑنے کا عزم کیا جنھوں نے آپ کی بیعت خلافت نہیں کی' تو آپ کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آئے اور کہا:

«يَا اَبَتِي دَعْ هٰذَا فَإِنَّ فِيهِ سَفْكَ دِمَاءِ الْمُسْلِمِينَ وَوُقُوعَ الاِخْتِلاَفِ بَيْنَهُمْ، فَلَمْ يَقْبَلْ مِنْهُ ذٰلِكَ، بَلْ صَمَّمَ عَلَى الْقِتَالِ وَرَتَّبَ الْجَيْشَ»

(البداية والنهاية: ٧/ ٢٤٠ حالات٣٦هـ دارالديان، مصر ١٩٨٨ء)

"ابا جان! اس ارادے کو ترک فرما دیجئے! اس میں مسلمانوں کی خون ریزی ہو گی

اور ان کے مابین اختلاف واقع (یعنی شدید) ہو گا۔ حضرت علی نے یہ رائے قبول نہیں کی اور لڑنے کے عزم پر قائم رہے اور لشکر کو مرتب کرنا شروع کر دیا۔"

اس کے نتیجے میں جب جنگ جمل ہوئی' جس کا سبب حضرت عائشہ اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کا قاتلین عثمان سے قصاص لینے کا مطالبہ بنا تھا' اس کے لیے یہ تینوں حضرات اپنے اعوان و انصار سمیت بصرہ آئے تاکہ وہ اپنے اس مطالبے پر عمل درآمد کے لیے قوت فراہم کریں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علم میں جب یہ بات آئی کہ یہ حضرات اس مقصد کے لیے بصرہ آ گئے ہیں تو حضرت علی نے اپنے اس لشکر کا رخ' جسے انہوں نے شام کے لیے تیار کیا تھا' بصرے کی طرف موڑ دیا تاکہ ان کو بصرے میں داخل ہونے سے روکیں اور اگر داخل ہو گئے ہوں تو ان کو وہاں سے نکال دیں۔ اس موقعے پر بھی حضرت حسن رضی اللہ عنہ راستے میں اپنے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملے اور ان سے کہا۔

"میں نے آپ کو منع کیا تھا لیکن آپ نے میری بات نہیں مانی' کل کو آپ اس حالت میں قتل کر دیئے جائیں گے کہ کوئی آپ کا مددگار نہیں ہو گا۔ حضرت علی نے کہا: تو تو مجھ پر ہمیشہ اس طرح جزع فزع کرتا ہے جیسے بچی جزع فزع کرتی ہے' تو نے مجھے کس بات سے منع کیا تھا جس میں میں نے تیری نافرمانی کی؟ حضرت حسن نے کہا: کیا قتل عثمان سے پہلے میں نے آپ کو نہیں کہا تھا کہ آپ یہاں سے نکل جائیں تاکہ آپ کی موجودگی میں یہ سانحہ نہ ہو' تاکہ کسی کو کچھ کہنے کا موقعہ نہ ملے؟ کیا قتل عثمان کے بعد میں نے آپ کو نہیں کہا تھا کہ آپ اس وقت تک لوگوں سے بیعت خلافت نہ لیں جب تک ہر شہر کے لوگوں کی طرف سے آپ کے پاس ان کی بیعت کی اطلاع نہ آ جائے؟ اور میں نے آپ کو یہ بھی کہا تھا جس وقت یہ خاتون (حضرت عائشہ) اور یہ دو مرد (حضرت طلحہ زبیر) (قصاص عثمان کا مطالبہ لے کر) نکلے' کہ آپ گھر میں بیٹھے رہیں۔ یہاں تک کہ یہ سب باہم صلح کر لیں۔ لیکن آپ نے ان سب باتوں میں میری نافرمانی کی۔" (البدایہ والنہایہ' ۷/۲۴۵)

پھر جب جنگ جمل شروع ہو گئی اور مسلمان ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگے' تو حضرت علی نے اپنے صاحبزادے حضرت حسن سے کہا۔

«يَا بُنَيَّ! لَيْتَ أَبَاكَ مَاتَ قَبْلَ هٰذَا الْيَوْمِ بِعِشْرِيْنَ عَامًا»

''بیٹے! کاش تیرا باپ اس دن سے ۲۰ سال قبل مر گیا ہوتا''

حضرت حسن نے کہا: يَا اَبَتِ قَدْ كُنْتُ اَنْهَاكَ عَنْ هٰذَا ''ابا جان! میں تو آپ کو اس سے منع ہی کرتا رہا۔'' (البدایہ' ۷/۲۵۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی رائے کو کیوں قبول نہیں کیا اور اس کے برعکس موقف کیوں اپنایا؟ یہ ایک الگ موضوع ہے جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں (اس کے لیے راقم کی کتاب ''خلافت و ملوکیت کی تاریخی و شرعی حیثیت'' کا مطالعہ مفید رہے گا) یہاں اس وقت یہ پہلو واضح کرنا مقصود ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اپنے مزاج و افتادِ طبع کے اعتبار سے نہایت صلح جُو تھے' وہ قدم قدم پر اپنے والد گرامی قدر کو بھی یہی پالیسی اختیار کرنے کی تلقین کرتے رہے اور پھر ۴۰ ھ میں حضرت علی کی شہادت کے بعد جب مسلمانوں کی زمام کار حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں آئی اور انہیں خلیفہ تسلیم کر لیا گیا تو اپنے اسی مزاج کی وجہ سے وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے اور لڑائی جھگڑے کو طول دینے کی بجائے صلح و مفاہمت کا راستہ اختیار کیا اور یوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیش گوئی کا مصداق بنے جو آپ نے حضرت حسن کے لیے فرمائی تھی کہ ان کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کروائے گا۔ یہ پیش گوئی پوری ہوئی اور حضرت حسن کے حسن تدبر' جذبۂ مفاہمت اور قربانی سے خانہ جنگی کا خاتمہ ہو گیا اور امن و استحکام کا ایک نیا دور شروع ہوا جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات یعنی ۶۰ ہجری تک رہا۔ حضرت معاویہ کے ۲۰ سالہ دورِ خلافت میں اسلامی قلمرو اندرونی شورشوں سے محفوظ رہی' امن و خوش حالی کا دَور دَورہ رہا اور اسلامی فتوحات کا سلسلہ' جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پانچ سالہ دور میں بند رہا' پھر سے نہ صرف جاری ہوا بلکہ اس کا دائرہ مسلسل وسعت پذیر رہا۔ یہ نتیجہ تھا حضرت حسن کی صلح پسندانہ پالیسی اور حضرت معاویہ کے حلم و تدبر اور حسن سیاست کا' رضی اللہ عنہما۔

۵ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دوسرے صاحبزادے حضرت حسین کا مزاج حضرت حسن سے

یکسر مختلف تھا' اس لیے ان پر دوسرے قسم کے اثرات مترتب ہوئے اور اسی کے مطابق ان کی پالیسی اور اقدامات سے نتائج بھی ہولناک ہی برآمد ہوئے۔ ان ہولناک نتائج کے پس منظر میں' ہمیں وہ سارے اسباب بہ یک وقت کارفرما نظر آتے ہیں جن کی وضاحت ہم نے گزشتہ صفحات میں کی۔ یعنی:

1 اپنے حق پر اور برتر ہونے کا احساس۔
2 اختلاف و انشقاق ہی کی راہ کو اپنانے پر اصرار۔
3 بدخواہوں کا حمائتیوں کے روپ میں انہیں اپنے مفادات و مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنے کی سعی۔

جہاں تک احساس برتری کا تعلق ہے' اس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ یقیناً حق بجانب تھے۔ فضائل و مناقب کے اعتبار سے وہ بلاشبہ یزید سے بدرجہا بہتر اور برتر تھے اور اس بنا پر اگر خلافت کے لیے ان کا انتخاب کر لیا جاتا تو بجاطور پر وہ اس کے مستحق تھے۔ لیکن حکومت و اقتدار کی تاریخ بھی یہی ہے اور اس کا تقاضا بھی یہی کہ اس میں فضائل کم دیکھے جاتے ہیں اور دوسرے عوامل زیادہ۔ یہی وجہ ہے کہ حکومتوں پر اکثر ایسے ہی لوگ فائز ہوتے چلے آئے ہیں جو مفضول ہوتے تھے اور افضل لوگ اس سے محروم۔ اسی لیے علمائے سیاست میں سے کسی نے بھی خلافت و حکومت کی اہلیت کے لیے افضلیت کو معیار تسلیم نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس سے ہٹ کر دوسرے' معیارات ہی کو بنیاد بنایا ہے۔ بنابریں محض افضیلت کی وجہ سے حضرت حسین ہی کو مستحق خلافت قرار دینا اور کسی مفضول کے اس منصب پر فائز ہونے کو یکسر رد کر دینا' معقول بات نہیں' اس طرح تو تاریخ اسلام کے بھی اکثر خلفاء و سلاطین نااہل قرار پائیں گے۔ حتیٰ کہ اس نکتے کی وضاحت کے لیے حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے ادوارِ خلافت ہی پر نظر ڈال لینا کافی ہے۔ اس میں بھی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ دونوں کی بابت صرف اس تبصرے ہی میں کافی رہنمائی ہے جو حافظ ابن کثیر نے کیے ہیں۔ حافظ ابن کثیر حضرت علی کی بابت لکھتے ہیں:

"امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ پر ان کے معاملات خراب ہو گئے تھے' ان کا لشکر ہی ان سے

اختلاف کرتا تھا اور اہل عراق نے ان کی مخالفت کی اور ان کا ساتھ دینے سے گریز کیا۔ اس کے برعکس (ان کے مخالف) اہل شام کا معاملہ مضبوط ہوتا گیا..... اور اہل شام کی قوت میں جتنا اضافہ ہوتا' اہل عراق کے حوصلے اتنے ہی پست ہو جاتے۔ ایسا اس حالت میں ہوا کہ ان کے امیر علی بن ابی طالب تھے جو اس وقت روئے زمین پر سب سے بہتر' سب سے زیادہ عابد و زاہد' سب سے زیادہ عالم اور اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے تھے' اس کے باوجود اہل عراق (یعنی ان کے اپنے ماننے والوں نے) ان کو بے یارومددگار چھوڑ دیا اور ان سے علیحدہ ہو گئے یہاں تک کہ حضرت علی زندگی ہی سے بیزار ہو گئے اور موت کی آرزو کرنے لگے اور یہ اس لیے ہوا کہ فتنے بہت زیادہ ہو گئے اور آزمائشوں کا ظہور ہوا۔"

(البدایۃ' ۳۲۵/۷' ذکر مقتل امیر المؤمنین علی بن ابی طالب)

خود حضرت علی نے ایک موقعے پر اپنے سر پر قرآن رکھا اور اہل کوفہ کی بابت بارگاہ الٰہی میں یوں عرض کناں ہوئے:

"اے اللہ! انہوں نے مجھے وہ کام نہیں کرنے دیئے جن میں امت کا بھلا تھا' پس تو مجھے ان کے ثواب سے محروم نہ رکھنا (پھر فرمایا) اے اللہ! میں ان سے اکتا گیا ہوں اور یہ مجھ سے اکتا گئے ہیں' میں انہیں ناپسند کرتا ہوں اور یہ مجھے ناپسند کرتے ہیں....." (البدایہ' ۱۳/۸)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر کے زمانے سے شام کے گورنر چلے آرہے تھے' جس پر وہ سالہا سال تک فائز رہے (گورنری کی یہ مدت ۲۰ سال شمار کی گئی ہے) ۴۰ھ میں حضرت معاویہ خلیفۃ المسلمین بن گئے اور اپنی وفات یعنی ۶۰ ہجری تک خلیفہ رہے' یوں ان کے دور حکومت و خلافت کی مدت ۴۰ سال بنتی ہے۔ اس چالیس سالہ دورِ حکمرانی پر تبصرہ کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"حضرت معاویہ کے دورِ گورنری میں فتوحات کا سلسلہ جاری اور روم و افرنگ وغیرہ کے علاقوں میں جہاد ہوتا رہا۔ پھر جب ان کے اور امیر المؤمنین حضرت علی کے درمیان اختلاف ہوا' تو فتوحات کا سلسلہ رک گیا اور ان ایام میں کوئی فتح نہیں ہوئی' حضرت علی کے ہاتھوں نہ حضرت معاویہ کے ہاتھوں۔ بلکہ حضرت معاویہ کی زیر امارت علاقے میں شاہ روم (عیسائی

حکمراں) دلچسپی لینے لگا' حالانکہ اسے اس سے قبل حضرت معاویہ ذلیل و رسوا اور اس کے لشکر کو مغلوب و مقہور کر چکے تھے' لیکن شاہِ روم نے جب دیکھا کہ معاویہ حضرت علی سے جنگ و پیکار میں مشغول ہو گئے ہیں تو وہ اپنی فوج کی ایک بڑی تعداد حضرت معاویہ کے بعض علاقوں کے قریب لے آیا اور اپنی حرص و طمع کے دانت تیز کر لیے تو حضرت معاویہ نے اسے لکھا:

"اللہ کی قسم! اے ملعون! اگر تو باز نہ آیا اور اپنے علاقے کی طرف واپس نہ لوٹا تو میں تیرے مقابلے کے لیے اپنے چچازاد (حضرت علی) سے صلح کر لوں گا اور تجھے تیرے سارے علاقے سے باہر نکال کر تجھ پر زمین' تمام تر فراخی کے باوجود' تنگ کر دوں گا۔"

یہ خط پڑھ کر شاہ روم ڈر گیا اور اپنے ارادے سے باز آ گیا اور صلح کا پیغام بھیج دیا۔ اس کے بعد تحکیم کا مرحلہ آیا اور پھر حضرت حسن بن علی سے صلح ہو گئی (اور حضرت معاویہ خلیفہ بن گئے) تو ان پر سب کا اتفاق ہو گیا اور ۴۱ھ میں ساری رعایا نے متفقہ طور پر ان کی بیعت کر لی۔ پھر اپنے سالِ وفات تک اس پوری مدت میں وہ مستقل بالامر رہے' دشمن کے علاقوں میں جہاد کا سلسلہ قائم رہا' اللہ کا کلمہ بلند رہا' اطراف و اکناف عالم سے مالِ غنیمت کی آمد جاری رہی اور مسلمان اس دور میں راحت سے رہے' عوام کے ساتھ ان کا معاملہ عدل و انصاف اور عفو و درگزر کا رہا۔" (البدایہ' ۸/۱۲۲)

فضائل و مناقب کے لحاظ سے حضرت علی' یقیناً حضرت معاویہ سے فائق اور افضل ہیں' لیکن افضل ہونے کے باوجود ان کا دورِ حکومت' حضرت معاویہ کے دورِ حکومت کے مقابلے میں جیسا کچھ رہا' وہ مذکورہ تبصروں سے واضح ہے' جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امور جہانبانی کا مسئلہ اپنی گوناگوں نوعیت اور وسعت کے اعتبار سے مختلف حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں زہد و ورع اور فضل و منقبت کے اعتبار سے ممتاز شخص بعض دفعہ ناکام اور اس سے کم تر فضیلت کا حامل شخص کامیاب رہتا ہے۔

اس لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک افضل شخص کو چھوڑ کر یزید کو اپنا جانشین بنایا' تو اس میں یقیناً یزید کے اندر اہلیت و صلاحیت کے علاوہ بہت سی حکمتیں اور مصلحتیں بھی

تھیں۔ ہمارے لیے اس بنا پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مطعون کرنے کا کوئی جواز ہے نہ یزید کی خلافت کو، جسے گنتی کے ۴ افراد کے علاوہ سب لوگوں نے اپنا خلیفہ تسلیم کر لیا تھا، غلط کہنے کی کوئی بنیاد۔ حضرت حسین کے لیے بھی یہی بات مناسب تھی کہ وہ اپنے سے مفضول شخص کی خلافت کو تسلیم کر لیتے، لیکن ایسا نہ ہو سکا اور ان کا احساس فضیلت ایک نہایت المناک سانحے کا سبب بن گیا۔

◐ ان کے اس احساس ہی نے انہیں اختلاف کی راہ پر گامزن کر دیا اور انہیں اس کے خطرناک عواقب کا احساس نہ ہونے دیا۔

◐ ان کے اسی احساس کی وجہ سے کوفیوں کو یہ حوصلہ ہوا کہ انہوں نے حضرت حسین کو ایسے خطوط لکھے جن میں ان کے احساس فضیلت کا سامان تھا اور جس نے ان کے احساس کو ایک عزم راسخ میں بدل دیا۔

بہرحال گفتگو یہ ہو رہی تھی کہ حضرت حسین کا مزاج، حضرت حسن کے مزاج سے یکسر مختلف تھا، جس کی وجہ سے انہوں نے حضرت حسن کی خلافت سے دست برداری اور حضرت معاویہ سے ان کے صلح کر لینے کو بھی ناپسند فرمایا تھا۔ (البدایۃ، ج:۸، ص:۱۷)

ان کا یہ مزاج ہی سانحۂ کربلا کا سب سے بڑا سبب بنا، --رضی اللہ عنہ-- اس کی مرحلہ وار تفصیل آئندہ صفحات میں مختصراً پیش کی جاتی ہے۔

پہلا مرحلہ -- ترک مدینہ

حضرت معاویہ کی وفات کے بعد جب یزید تخت خلافت پر متمکن ہوا، تو یزید کی طرف سے مقرر گورنر مدینہ ولید بن عتبہ نے حضرت حسین کو بلا کر یزید کی بیعت کرنے کا کہا، تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"مجھ جیسا شخص پوشیدہ بیعت نہیں کرتا اور میرے خیال میں تمہارے نزدیک بھی میری خفیہ بیعت کافی نہیں ہو گی جب تک کہ ہم اسے لوگوں کے سامنے علانیہ طور پر نہ کریں۔ (ولید نے کہا) ٹھیک ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے مزید فرمایا: جب تم سب لوگوں سے بیعت لو گے تو ہمیں بھی لوگوں کے ساتھ بلا لینا، پس ایک ساتھ ہی سب کام ہو جائے گا۔" (الطبری، ۲۵۱/۴، مطبعۃ الاستقامۃ، قاہرہ، ۱۹۳۹ء۔ البدایۃ و النہایۃ، ۱۵۰/۸)

ولید نے کہا اور وہ عافیت پسند شخص تھا۔

«فَانْصَرِفْ عَلَى اسْمِ اللهِ حَتَّى تَأْتِيَنَا مَعَ جَمَاعَةِ النَّاسِ»

"اللہ کا نام لے کر جائیے! اور لوگوں کے ساتھ ہمارے پاس آجائیے گا۔"

دوسرے روز سارا دن گزر جانے کے بعد رات کو ولید نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلوانے کے لیے آدمی بھیجے تو حضرت حسین نے ان سے کہا: "صبح ہو لینے دو! پھر دیکھا جائے گا' تم بھی دیکھنا ہم بھی جائزہ لیں گے۔"

وہ واپس چلے گئے اور انہوں نے اصرار نہیں کیا۔ لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ اسی رات کو مدینے سے عازمِ مکہ ہو گئے اور اپنے بیٹوں' بھائیوں' بھتیجوں اور تمام اہل خانہ کو بھی ساتھ لے لیا' صرف ان کے بھائی محمد بن حنفیہ نے نہ صرف ساتھ جانے سے انکار کر دیا بلکہ خود حضرت حسین کو بھی اس قسم کے اقدام سے روکنے کی کوشش کی۔ چنانچہ چھوٹے ہوتے ہوئے بھی انہوں نے اس موقعے پر اپنے برادرِ اکبر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو حسب ذیل نصیحت کی۔

"بھائی جان! آپ مجھے لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ عزیز ہیں' مخلوق میں آپ سے زیادہ کوئی حق دار نہیں ہے جس کے لیے میں خیرخواہی ذخیرہ کر کے رکھوں (یعنی آپ کو اپنی خیرخواہانہ نصیحت کا سب سے زیادہ حق دار سمجھتا ہوں) آپ اپنے ساتھیوں کو حتی الامکان یزید سے اور شہروں سے دور رکھیں۔ پھر اپنے قاصد لوگوں کی طرف بھیجیں اور انہیں اپنی خلافت کی دعوت دیں' اگر وہ آپ کی بیعت کر لیں تو اس پر اللہ کا شکر کریں اور اگر لوگ آپ کے سوا کسی اور پر متفق ہو جائیں تو اس سے اللہ آپ کے دین میں کوئی کمی کرے گا نہ آپ کی عقل میں اور اس سے آپ کی مروت ختم ہو گی نہ آپ کی فضیلت۔ مجھے خدشہ ہے کہ اگر آپ نے کسی شہر میں قیام کیا اور لوگوں کا آپ کے پاس آنا جانا ہوا تو لوگ آپس میں مختلف ہو جائیں گے' کچھ آپ کے ساتھ اور کچھ آپ کے مخالف' اور وہ آپس میں لڑیں گے تو آپ ہی سب سے پہلا نشانہ بن جائیں گے....."

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں یہی کہا' بھائی! میں تو اپنے (مکہ) جانے کے

ارادے پر قائم ہوں۔ اس پر محمد بن حنفیہ نے کہا۔

"پھر آپ مکے ہی میں قیام فرمائیں' اگر وہاں صورت حال اطمینان بخش ہو تو فبہا' وگرنہ آپ وادیوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں کو اپنا مسکن بنائیں اور ایک شہر سے دوسرے شہر جا کر جائزہ لیتے رہیں اور دیکھیں کہ لوگوں کا معاملہ کیا رخ اختیار کرتا ہے۔ اس کی روشنی میں آپ کوئی رائے قائم فرمائیں۔ یہ رائے درست بھی ہو گی اور اس پر عمل' حزم و احتیاط کا مظہر بھی....."

حضرت حسین نے فرمایا:

"میرے بھائی! تمہاری نصیحت مشفقانہ ہے اور مجھے امید ہے کہ تمہاری رائے سدید (درست) مُوَفَّق (من جانب اللہ) ہے۔"

لیکن اس کے باوجود حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنا ارادہ ختم نہیں کیا اور مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ (الطبری' ۴/۲۵۳- البدایة' ۸/۱۵۰)

دوسرا مرحلہ -- مکے میں قیام اور لوگوں کے خیر خواہانہ مشورے

کہا جاتا ہے کہ حضرت حسین اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما دونوں جب یزید کی بیعت سے بچنے کے لیے مکہ جا رہے تھے تو ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما مکے سے واپس آ رہے تھے' یہ دونوں حضرت حسین اور ابن زبیر کو راستے میں ملے اور انہوں نے ان سے ان کے مدینے سے مکہ آنے کی بابت پوچھا' تو حضرت حسین اور ابن زبیر نے بتلایا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہو گئی ہے اور یزید کے لیے بیعت لی جا رہی ہے۔ تو حضرت ابن عمر اور ابن عباس نے ان دونوں کو خطاب کر کے کہا: "اللہ سے ڈرو! اور مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ مت ڈالو۔" (الطبری' ۴/۲۵۴)

حافظ ابن کثیر نے دونوں کے اقوال کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے' وہ بھی ملاحظہ فرما لیے جائیں۔ مکے کے دورانِ قیام حضرت ابن عباس حضرت حسین کے پاس آئے اور کہا۔

"بھتیجے! میں صبر کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن صبر نہیں ہوتا' مجھے تمہارے اس طرز عمل سے ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ عراقی بے وفا لوگ ہیں' ان کی وجہ سے دھوکہ مت کھاؤ! تم

اس میں قیام رکھو' یہاں تک کہ عراقی اپنے دشمن کو وہاں سے نکال دیں' پھر بے شک تم وہاں چلے جانا۔ بصورت دیگر تم یمن چلے جاؤ' وہاں قلعے اور گھاٹیاں (یعنی پناہ گاہیں) ہیں اور وہاں تمہارے والد کے حمایتی بھی ہیں' تم لوگوں سے کنارہ کش رہو' ان کو لکھ دو اور اپنے داعی ان کے ہاں بھیج دو' اس طرح مجھے امید ہے کہ تم جو چاہتے ہو وہ تمہیں حاصل ہو جائے گا۔"

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کہا: "ابن عم! اللہ کی قسم! میں جانتا ہوں کہ تم خیر خواہ اور مہربان ہو' لیکن میں نے (کوفہ) جانے کا تہیہ کر لیا ہے۔"

حضرت ابن عباس نے کہا: "اگر تم نے ضرور جانا ہی ہے تو اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کو مت لے جاؤ! اس لیے کہ اللہ کی قسم! مجھے اندیشہ ہے کہ تم اسی طرح قتل نہ کر دیئے جاؤ جیسے عثمان قتل کیے گئے اور ان کی عورتیں اور ان کے بچے ان کو دیکھتے ہی رہ گئے۔"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی بابت آتا ہے کہ ان کے قیام مکہ کے دوران انہیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے عراق جانے کی اطلاع ملی' تو وہ تین راتوں کی مسافت طے کر کے ان سے ملے اور ان سے پوچھا کہ آپ کا کیا ارادہ ہے؟ حضرت حسین نے فرمایا: میں عراق جا رہا ہوں اور ان کے ہاتھوں میں خطوط تھے' ان کی طرف اشارہ کر کے انہوں نے کہا' دیکھو! یہ ان کے خطوط اور ان کی طرف سے بیعت کا عہد و پیمان ہے۔ حضرت ابن عمر نے کہا۔ آپ ان کے پاس نہ جائیں۔ حضرت حسین نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ تو حضرت ابن عمر نے کہا' میں آپ کو ایک حدیث سناتا ہوں۔

"جبریل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے آپ کو اختیار دیا کہ آپ دنیا اور آخرت میں سے جسے چاہیں پسند کر لیں' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے مقابلے میں آخرت کو پسند فرمایا۔"

اور آپ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لخت جگر ہیں' اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی بھی دنیا حاصل کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو گا اور اللہ نے تم لوگوں سے دنیا کو اس سے بہتر چیز کے لیے پھیرا ہے۔ یہ سب باتیں سن کر بھی حضرت حسین نے واپس ہونے سے انکار کر دیا۔ تو حضرت ابن عمر نے حضرت حسین کو اپنے سینے سے چمٹا لیا اور رونے لگے اور فرمانے

لگے: "(مستقبل میں) قتل کیے جانے والے' میں تمہیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔" (البدایۃ' ۱۶۱/۸)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے علم میں جب یہ بات آئی کہ حضرت حسین کے پاس اہل کوفہ کے خطوط آ رہے ہیں' تو وہ حضرت حسین سے ملے اور ان سے کہا:

"اے ابو عبداللہ! میں تمہارا خیرخواہ اور تمہاری بابت اندیشے میں مبتلا ہوں۔ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تمہارے حمایتی کوفیوں کی طرف سے تمہیں خطوط آ رہے ہیں جن میں وہ تمہیں یزید کے مقابلے میں کھڑے ہونے کی دعوت دے رہے ہیں (لیکن میری نصیحت یہ ہے کہ) تم وہاں مت جانا' اس لیے کہ میں نے تمہارے والد کو کوفے میں یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

"اللہ کی قسم! میں ان (کوفیوں) سے اکتا گیا ہوں اور میں ان سے نفرت رکھتا ہوں اور وہ مجھ سے اکتا گئے ہیں اور مجھ سے نفرت کرتے ہیں اور ان سے کبھی وفا کی امید نہیں۔"

(البدایۃ والنہایۃ' ۸/ ۱۶۳)

ان کے علاوہ اور بھی متعدد حضرات نے حضرت حسین کو اہل کوفہ پر اعتبار کر کے کوفہ جانے سے اور یزید کے خلاف کوئی اقدام کرنے سے روکا اور اس اقدام کی خطرناکیوں سے انہیں آگاہ کیا' مثلاً حضرت ابو واقد لیثی' حضرت جابر بن عبداللہ' حضرت سعید بن مسیب' ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن' حضرت مسور بن مخرمہ' عمرہ بنت عبدالرحمٰن' بکر بن عبدالرحمٰن بن حارث' عبداللہ بن مطیع اور عبداللہ بن جعفر وغیرہم۔ حتیٰ کہ گورنر مکہ عمرو بن سعید نے بھی انہیں کوفہ جانے سے روکا اور مکے ہی میں رہنے پر زور دینے کے علاوہ ان کے حفظ و امان کی ضمانت دی اور ان سے حسن سلوک کا وعدہ کیا۔ بلکہ خود یزید نے بھی ایک مکتوب حضرت ابن عباس کے نام لکھا اور انہیں کہا کہ وہ حضرت حسین کو اپنے مجوزہ اقدام سے روکیں' اس سے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا ہو گا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (البدایۃ' ۸/ ۱۶۳-۱۶۸- الطبری ۲۸۶/۴-۲۸۸)

بلکہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تک بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے حضرت

حسین کو عراق جانے سے روکا اور انہیں اہل عراق کی بے وفائی یاد دلائی۔ (البدایہ' ۱۶۳/۸)

روکنے اور سمجھانے کی ایک کوشش حضرت حسین کے ایک اور قریبی عزیز حسین کے چچا زاد اور بہنوئی عبداللہ بن جعفر نے بھی نہایت مؤثر انداز میں کی۔ حضرت حسین جب مکے سے کوفہ جانے کے لیے نکلے تو عبداللہ بن جعفر نے ایک مکتوب لکھ کر اپنے دو بیٹوں کے ہاتھ حضرت حسین کو بھیجا' اس میں انہوں نے تحریر کیا۔

"میں اللہ کا واسطہ دے کر آپ کو کہتا ہوں کہ آپ (راستے ہی سے) لوٹ آئیں اور میرے خط کو غور سے پڑھیں' مجھے آپ کی بابت یہ اندیشہ ہے کہ آپ نے جس طرف رُخ کیا ہے اس میں آپ کی بھی ہلاکت ہے اور آپ کے گھر والوں کی بھی۔ آج اگر آپ ہلاک ہوگئے تو اسلام کی روشنی بجھ جائے گی۔ اس لیے کہ آپ ہدایت یافتہ لوگوں کا علَم اور اہل ایمان کی امیدوں کا مرکز ہیں۔ پس آپ (کوفہ) جانے میں عجلت سے کام نہ لیں' میں بھی (مزید گفتگو کے لیے) اپنے خط کے پیچھے آپ کے پاس آ رہا ہوں۔" والسلام۔

یہ خط روانہ کر کے وہ خود گورنر مکہ عمرو بن سعید کے پاس گئے اور ان سے کہا:

"آپ حسین کے نام ایک خط لکھ دیں جس میں آپ کی طرف سے حفظ و امان کی ضمانت' حسن سلوک اور صلہ رحمی کی تمنا کا اظہار اور اپنے خط میں ان کے لیے عہد کی پاسداری کی یقین دہانی ہو۔ نیز ان سے واپس آنے کا مطالبہ کریں' شاید اس سے وہ مطمئن ہو جائیں اور لوٹ آئیں۔"

گورنر مکہ عمرو بن سعید نے عبداللہ بن جعفر سے کہا:

"آپ جو چاہیں' لکھ کر میرے پاس لے آئیں' میں اس پر مہر لگا دوں گا۔"

چنانچہ عبداللہ بن جعفر نے عمرو بن سعید کی طرف سے اپنی خواہش کے مطابق ایک تحریر تیار کی اور پھر عمرو بن سعید کے پاس لائے۔ انہوں نے اس پر اپنی مہر ثبت کر دی۔ عبداللہ بن جعفر نے ان سے مزید درخواست کی کہ آپ میرے ساتھ اپنی امان بھی بھیجیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنا بھائی یحییٰ ساتھ بھیج دیا۔ یہ دونوں گئے اور راستے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے ملے اور انہیں گورنر کا خط پڑھ کر سنایا' لیکن حضرت حسین نے واپس آنے سے

انکار کر دیا اور کہا:

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا ہے' انہوں نے مجھے ایک کام کرنے کا حکم دیا ہے' جسے میں بہرصورت کروں گا۔"

عبداللہ بن جعفر اور یحییٰ بن سعید نے کہا' وہ خواب کیا ہے؟ حضرت حسین نے کہا:

"میں اسے کسی کے سامنے بیان نہیں کروں گا تا آنکہ میں اپنے رب عزوجل سے جا ملوں۔" (البدایہ و النہایۃ' ۱۶۹/۸- الطبری' ۲۹۱/۴-۲۹۲)

نظر باز گشت

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد یزید کی بیعت کا جو مسئلہ سامنے آیا جس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ سمیت صرف چار اشخاص نے اختلاف کیا۔ ان میں سے حضرت حسین سے مدینے میں بیعت لینے کا مطالبہ کیا گیا' لیکن حضرت حسین نے اس معاملے کو مؤخر کر دیا اور پھر وہاں سے مکہ تشریف لے گئے' مکے میں بھی ان سے تعرض نہیں کیا گیا۔ گویا دونوں شہروں میں ان کے احترام و وقار کو ملحوظ رکھا گیا' ان پر کسی قسم کی سختی کی گئی نہ ان سے کوئی بازپرس ہی ہوئی۔ نرمی اور عزت و احترام کا یہ معاملہ یزید کی اجازت یا رضامندی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یزید نے اس وصیت کو اپنے سامنے رکھا جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی بابت بطور خاص کی تھی' یہ وصیت حسب ذیل تھی۔

"حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے' رسول اللہ کی صاحبزادی فاطمہ کے جگر گوشے 'حسین' کا خیال رکھنا' وہ لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب ہیں' پس ان کے ساتھ صلہ رحمی اور نرمی کا معاملہ کرنا' اس سے تیرے لیے ان کا معاملہ درست رہے گا اور اگر ان سے کسی چیز کا صدور ہوا تو مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے ان سے ان لوگوں کے ذریعے سے کافی ہو جائے گا جنہوں نے اس کے باپ کو قتل کیا اور اس کے بھائی کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔"

(البدایۃ ۱۶۱/۸)

اس نرم پالیسی ہی کا نتیجہ تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے عزمِ کوفہ میں کوئی لچک پیدا نہیں ہوئی اور خیر خواہوں کے سمجھانے کے باوجود انہوں نے اپنے ارادے میں تبدیلی کی ضرورت

محسوس نہیں کی۔

تیسرا مرحلہ -- روانگی کوفہ

حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب مدینے سے مکہ تشریف لے گئے اور وہاں چند مہینے قیام رہا' اس دوران اہل کوفہ کی طرف سے آپ کے پاس خطوط آتے رہے جن میں ان کی طرف سے آپ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کرنے اور یزید کے گورنر کو کوفے سے نکال باہر کرنے کے عزم کا اظہار کیا جاتا تھا۔ اہل کوفہ کے ان خطوط نے بھی اہل خیر و اہل صلاح کے مشورے اور رائے کو نظرانداز کرنے میں مؤثر کردار ادا کیا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ان کو اعتناء کے قابل نہیں سمجھا۔

چنانچہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا تاکہ وہ معلوم کریں کہ وہاں کے لوگ واقعی وہی کچھ چاہتے ہیں جس کا اظہار انہوں نے خطوط میں کیا ہے' مسلم بن عقیل مکے سے پہلے مدینہ آتے ہیں اور وہاں سے وہ دو اشخاص کو رہنمائی کے لیے ساتھ لیتے ہیں۔ راستے میں ایک شخص تو شدت پیاس اور راستے کی مشکلات کی تاب نہ لاکر فوت ہو جاتا ہے۔ اس سے مسلم بن عقیل کے ارادے میں کچھ تزلزل واقع ہوتا ہے اور حضرت حسین سے درخواست کرتے ہیں کہ انہیں کوفہ جانے پر مجبور نہ کریں۔ لیکن حضرت حسین ان کی درخواست کو رد کر کے انہیں اپنا سفر جاری رکھنے کی تاکید کرتے ہیں۔ بہرحال مسلم بن عقیل کوفہ پہنچ جاتے ہیں اور وہاں لوگوں سے رابطہ کر کے اپنے مشن کا آغاز کرتے ہیں۔

ادھر یزید کی طرف سے مقرر گورنر کوفہ حضرت نعمان بن بشیر کو ان سرگرمیوں کی اطلاع ہوتی ہے تو وہ لوگوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ وہ اس قسم کی سرگرمیوں سے دور رہیں اور امیرالمؤمنین یزید کی اطاعت کے دائرے سے نکلنے کی کوشش نہ کریں۔ لیکن ان کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے سے انہوں نے گریز کیا' جس سے حامیانِ یزید میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ گورنر کی اس نرم پالیسی سے شورش میں اضافہ ہو گا اور اسے روکنا ممکن نہیں ہو گا۔

چنانچہ بعض حضرات نے اس امر کی اطلاع یزید کو دی کہ اگر وہ اس علاقے کو بدستور اپنے کنٹرول میں رکھنا چاہتا ہے تو اس کا حل سوچے۔ یزید نے مشورے کے بعد کوفے کا

انتظام بھی عبیداللہ بن زیاد کو سونپ دیا جو بصرے کا پہلے ہی گورنر تھا اور اسے یہاں کے سیاسی معاملات سے سختی کے ساتھ نمٹنے کی تاکید کی۔ اب ابن زیاد بیک وقت بصرہ اور کوفہ دونوں شہروں کا حاکم اعلیٰ بن گیا۔

مسلم بن عقیل جب کوفہ آئے' تو ہزاروں لوگوں نے ان کے ہاتھ پر حسین رضی اللہ عنہ کے لیے بیعت کی اور حضرت حسین کی وہاں آمد کے لیے اپنا اشتیاق ظاہر کیا۔ مسلم بن عقیل نے اس سے یہ تاثر لیا کہ یہاں فضا حضرت حسین کے لیے تیار اور زمین ہموار ہے۔ انہوں نے حضرت حسین کو خط لکھ دیا کہ وہ یہ خط ملتے ہی فوراً کوفے کے لیے روانہ ہو جائیں' یہاں کے لوگ ان کے مشتاق اور منتظر ہیں۔ حضرت حسین یہ خط پڑھ کے مکے سے کوفے کے سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ راستے میں کچھ اور لوگ بھی شریک سفر ہو جاتے ہیں۔ لیکن صحابہ و تابعین میں سے کوئی آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار نہیں ہوا' بلکہ ان میں سے جس جس کو بھی آپ کے ارادے اور سفر کا علم ہوا' تو اس نے آپ کو روکا اور اس ارادے اور سفر کو نہایت خطرناک اور اتحاد و اتفاق کے خلاف قرار دیا۔ (جیسا کہ اس کی ضروری تفصیل پہلے بیان ہوئی)

اُدھر کوفے میں جب مسلم بن عقیل کی سرگرمیاں عبیداللہ بن زیاد کے علم میں آئیں تو اس نے سخت اقدامات اختیار کیے اور لوگوں کو ڈرایا دھمکایا' جس کے نتیجے میں مسلم بن عقیل کے گرد جمع ہونے والے لوگ منتشر اور حضرت حسین کا ساتھ دینے سے منکر ہو گئے اور بالآخر مسلم بن عقیل بھی قتل کر دیئے گئے۔ قتل سے قبل مسلم بن عقیل کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ میرا تو کوفے سے زندہ بچ کر جانا مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن حضرت حسین اور ان کے ہمراہیوں کا کیا بنے گا جنہیں میرا خط مل گیا ہو گا اور وہ کوفے کے لیے روانہ ہو گئے ہوں گے۔ انہوں نے ایک شخص کے ذمے یہ بات لگائی کہ وہ کسی طرح حضرت حسین تک میرا یہ پیغام پہنچا دے کہ وہ ہرگز کوفہ نہ آئیں' اہل کوفہ جھوٹے نکلے' انہوں نے مجھے بھی دھوکہ دیا' یہاں حالات اس کے بالکل برعکس ہیں جو میں نے اس سے قبل تحریر کیے تھے اور خط پہنچنے تک شاید میں قتل کر دیا جاؤں۔

جس شخص کے ذمے یہ بات لگائی گئی تھی، اس نے کسی اور شخص کے ذریعے سے مسلم بن عقیل کا یہ پیغام حضرت حسین تک پہنچا دیا۔ راستے میں ملنے والے بعض حضرات نے بھی آپ کو واپس ہو جانے کا مشورہ دیا اور ایک روایت میں ہے کہ قادسیہ سے تین میل پہلے آپ کو حر بن یزید تمیمی نامی شخص ملا (خیال رہے قادسیہ سے کوفے کا فاصلہ تقریباً پچاس میل ہے) اس نے آپ کے سفر کی بابت پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ آپ کی وضاحت پر اس نے کہا، آپ وہاں نہ جائیں بلکہ لوٹ جائیں، میں وہیں (کوفہ) سے آ رہا ہوں مجھے آپ کے لیے وہاں کسی بھلائی کی امید نہیں ہے۔

یہ صورت حال دیکھ اور جان کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے تو واپسی کا ارادہ کر لیا، لیکن آپ کے قافلے میں شریک مسلم بن عقیل کے بھائی بولے، اللہ کی قسم! ہم تو واپس نہیں جائیں گے، بلکہ اپنے بھائی کا انتقام لیں گے یا خود بھی قتل ہو جائیں گے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا، پھر تمہارے بعد میری زندگی بھی بے مزہ ہے اور سفر جاری رکھا۔ تاہم آپ نے ان لوگوں کو، جو راستے میں آپ کا مقصد سفر معلوم کر کے آپ کے ساتھ ہو لئے تھے، جانے کی رخصت دے دی، چنانچہ ایسے سب لوگ قافلے سے علیحدہ ہو گئے اور آپ کے ساتھ صرف وہی لوگ رہ گئے جو ابتدائے سفر یعنی مکے ہی سے آپ کے ساتھ آئے تھے۔

چوتھا مرحلہ -- کربلا میں صلح کی کوشش اور اس میں ناکامی

روایات میں ہے کہ جب واپسی کی بجائے، آگے ہی جانے کا فیصلہ کر لیا گیا، تو تھوڑے ہی فاصلے پر ابن زیاد کی طرف سے روانہ کردہ لشکر وہاں آ گیا، جسے دیکھ کر حضرت حسین نے اپنا رُخ کربلا (یعنی شام) کی طرف کر لیا۔ ابن زیاد کے اس لشکر کے قائد عمر بن سعد بن ابی وقاص تھے جو ایک صحابی کے فرزند اور فرزند رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قدر شناس تھے، وہ اس معاملے کو مفاہمانہ انداز میں سلجھانا چاہتے تھے، لیکن قضاء و قدر کے فیصلے کچھ اور تھے اس لیے ان کی تدبیر اور مساعیٔ صلح ناکام رہیں اور ہمارے خیال میں اس کی بڑی وجہیں دو باتیں بنیں۔

ایک ابن زیاد کا سخت گیر حاکمانہ رویہ۔

دوسری، حضرت حسین کا ابن زیاد کی انتظامی مصلحت کے مقابلے میں اپنی عزت نفس اور وقار کو زیادہ اہمیت دینا۔

اگر ان میں سے کسی ایک کی طرف سے بھی لچک کا مظاہرہ کیا جاتا، تو شاید یہ المیہ رونما نہ ہوتا، لیکن چونکہ اللہ کی مشیت یہی تھی، جس کی حکمت وہی بہتر جانتا ہے، اس لیے دونوں ہی اپنی اپنی بات پر مصر رہے جس کا بالآخر وہی نتیجہ نکلا جس کا اندیشہ آغازِ سفر ہی میں خیرخواہانِ حسین نے ظاہر کیا تھا۔

بہرحال ہمارے خیال کے مطابق آخر میں اس حادثے کے وقوع پذیر ہونے کی یہی مذکورہ دو وجہیں ہیں، جس کی صورت یہ بنی کہ حضرت حسین نے عمر بن سعد کے سامنے تین باتیں پیش فرمائیں اور فرمایا کہ ان میں سے کوئی ایک بات اختیار کر لیں۔

1. مجھے چھوڑ دو، میں جہاں سے آیا ہوں وہیں چلا جاتا ہوں۔
2. یا مجھے یزید کے پاس جانے دو، تاکہ میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دوں۔ یعنی اس کی بیعت کر لوں، پھر وہ خود میرے بارے میں فیصلہ کر لے گا۔
3. یا مجھے کسی سرحد پر جانے کی اجازت دے دو۔ (البدایۃ ۸/۱۷۱۔ الطبری ۴/۲۹۳)

اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت حسین نے اللہ اور اسلام کا واسطہ دے کر کہا:

"انہیں امیرالمؤمنین (یزید) کے پاس لے چلیں، وہ اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ رکھ دیں گے (یعنی بیعت کر لیں گے۔)" (البدایہ:۸/۱۷۲، الطبری:۴/۲۹۵)

یعنی اس روایت کی رُو سے انہوں نے صرف ایک ہی مطالبہ پیش کیا اور وہ تھا، بیعت کرنے کے لیے یزید کے پاس لے جانے کا، علاوہ ازیں اس میں انہوں نے یزید کے لیے "امیرالمؤمنین" کا لفظ بھی استعمال فرمایا۔ جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اپنے سابقہ موقف سے، وہ جو بھی تھا، انہوں نے رجوع کر لیا ہے اور یزید کو امیرالمؤمنین تسلیم اور ان کی بیعت کر لینے کے لیے وہ تیار ہیں۔

حضرت حسین کا آخری وقت میں اپنے موقف سے رجوع، اللہ تعالیٰ کا ان پر خاص فضل وکرم تھا جس کی وجہ سے خلیفۂ وقت کے خلاف خروج اور مسلمانوں کے متفقہ دھارے

سے کٹ کر ایک جداگانہ راستہ اختیار کرنے کا جو الزام ان پر عائد ہو سکتا تھا' اس سے وہ بچ گئے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ.

اس رجوع اور مذکورہ مطالبے کے بعد ان سے تعرض کرنے اور ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا' اس لیے حضرت عمر بن سعد نے (ان کی بات کو تسلیم کر کے) یہ مطالبے ابن زیاد کو لکھ کر بھیج دیئے تاکہ وہ ان کی منظوری دے دے۔ لیکن اس نے سخت رویہ اختیار کیا اور کہا کہ وہ پہلے یہاں میری بیعت کریں' تب میں انہیں یزید کے پاس جانے کی اجازت دوں گا۔ حضرت حسین کی طبع غیور نے اس بات کو پسند نہیں کیا اور فرمایا: لایکون ذلک ابداً ' ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔

اس کے نتیجے میں وہ جنگ شروع ہو گئی جس میں حضرت حسین اپنے بچوں اور اعوان و انصار سمیت مظلومانہ طور پر قتل کر دیئے گئے اور یوں یہ سب حضرات مظلومیت کی موت سے ہم کنار ہو کر شہادت کے رتبۂ بلند پر فائز ہو گئے۔ رَحِمَهُمُ اللّٰهُ وَ رَضِيَ عَنْهُمْ.

سانحۂ کربلا کی یہ وہ ضروری تفصیل ہے جو تاریخ کی ساری کتابوں میں موجود ہے۔ ہم نے غیر ضروری اور غیر مستند تفصیلات سے بچتے ہوئے واقعے کی اصل حقیقت بیان کر دی ہے۔ اس سے حسب ذیل باتیں واضح طور سامنے آتی ہیں۔

خلاصۂ ماسبق یا سانحۂ کربلا کے اہم اسباب

اس کا پہلا سبب' خاندانی رقابت و آویزش تھی جو باپوں سے اولاد میں منتقل ہوئی۔ حضرت حسن نے اپنی صلح جُو طبیعت کی وجہ سے اس کو بڑھایا نہیں بلکہ اپنے عمل سے اس کو ختم فرما دیا۔ جب کہ حضرت حسین نے اس کے برعکس دوسرا راستہ اختیار فرمایا جو بالآخر ان کی مظلومانہ شہادت پر منتج ہوا۔

2 دوسرا سبب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اپنے کو خلافت کا اہل تر سمجھنا تھا' لیکن حالات نے مساعدت نہیں کی۔ یوں وہ ظالموں کی مشق ستم کا نشانہ بن گئے۔

3 اہل کوفہ کے خطوط' جنہوں نے حضرت حسین کے دل میں امید کے دیئے روشن کر دیئے' حالانکہ اہل کوفہ کا تاریخی کردار واضح تھا' اس کی رُو سے وہ بے وفا اور

ناقابل اعتبار تھے۔

4 حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خیرخواہوں کے مخلصانہ مشوروں کو نظرانداز کر کے صرف اپنے طور پر فیصلہ کرنا اور نتائج سے بے پرواہو کر اقدام کرنا۔

5 گورنر کوفہ ابن زیاد کا سخت گیر حاکمانہ رویہ' جس کا کوئی جواز نہیں تھا۔

6 حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ابن زیاد کے انتظامی حکم کے مقابلے میں اپنی عزت نفس اور وقار کو عزیز تر رکھنا' حالانکہ اگر وہ موقعے کی نزاکت اور حالات کی خطرناکی کے پیش نظر تھوڑی سی لچک اختیار کر لیتے' تو شاید اس المیے سے بچنا ممکن ہو جاتا۔

بنابریں یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ قضا و قدر کا فیصلہ سب پر غالب رہا' کیونکہ اس کو ٹالنے پر کوئی قادر ہی نہیں۔ ایسے موقعوں پر بڑی بڑی تدبیریں بھی ناکام ہی رہتی ہیں اور بڑے بڑے اقدامات بھی سعیِ لاحاصل۔ اس لیے کہ ماشاء اللّٰہ کان ومالم یشأ لم یکن۔ وماتشاؤون الا ان یشاء اللّٰہ رب العالمین۔



-- ۱۲ --

رسوماتِ محرم --- علمائے اسلام کی نظر میں

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ | حجۃ الاسلام شاہ ولی نے فرمایا:

«يَا مُعَاشِرَ بَنِيْ أٰدَمَ اتَّخَذْتُمْ رُسُوْمًا فَاسِدَةً تُغَيِّرَ الدِّيْنَ اجْتَمَعْتُمْ يَوْمَ عَاشُوْرَآءَ فِي الْأَبَاطِيْلِ فَقَوْمٌ اتَّخَذَهُ مَاتَمًا أَمَا تَعْلَمُوْنَ أَنَّ الْأَيَّامَ أَيَّامُ اللهِ وَالْحَوَادِثَ مِنْ مَشِيْئَةِ اللهِ وَإِنْ كَانَ حُسَيْنٌ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قُتِلَ فِيْ هٰذَا الْيَوْمِ فَأَيُّ يَوْمٍ لَمْ يَمُتْ فِيْهِ مَحْبُوْبٌ مِّنَ الْمَحْبُوْبِيْنَ وَقَدِ اتَّخَذُوْهُ لَعْبًا بِحِرَابِهِمْ وَسِلَاحِهِمْ ... اِتَّخَذْتُمُ الْمَاتَمَ عِيْدًا كَأَنَّ إِكْثَارَ الطَّعَامِ وَاجِبٌ عَلَيْكُمْ وَضَيَّعْتُمُ الصَّلٰوةَ وَقَوْمٌ اسْتَغَلُّوْا بِمَكَاسِبِهِمْ فَلَمْ يَقْدِرُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ»

(التفيهمات الإلٰهية ۱/ تفهيم: ۶۹/ ۲۸۸ طبع حيدر آباد سندھ ۱۹۷۰ء)

"اے بنی آدم! تم نے اسلام کو بدل ڈالنے والی بہت سی رسمیں اپنا رکھی ہیں (مثلاً) تم دسویں محرم کو باطل قسم کے اجتماع کرتے ہو۔ کئی لوگوں نے اس دن کو نوحہ و ماتم کا دن بنالیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے حادثے ہمیشہ رونما ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس دن (مظلوم شہید کے طور پر) قتل کیے گئے۔ تو وہ کون سا دن ہے۔ جس میں کوئی نہ کوئی اللہ کا نیک بندہ فوت نہیں ہوا (لیکن تعجب کی بات ہے کہ) انہوں نے اس سانحہ شہادت مظلومانہ کو کھیل کود کی چیز بنالیا..... تم نے ماتم کو عید کے تہوار کی طرح بنالیا' گویا اس دن زیادہ کھانا پینا فرض ہے اور نمازوں کا تمہیں کوئی خیال نہیں (جو فرض ہے) ان کو تم نے ضائع کر دیا' یہ لوگ اپنے ہی من گھڑت کاموں میں مشغول رہتے ہیں' نمازوں کی توفیق ان کو ملتی ہی نہیں۔"

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ۳۵۴ھ کے واقعات میں ماتمی جلوسوں کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

«وَهٰذَا تَكَلُّفٌ لاَ حَاجَةَ إِلَيْهِ فِي الإِسْلاَمِ وَلَوْ كَانَ أَمْرًا مَّحْمُوْدًا لَّفَعَلَهُ خَيْرُ الْقُرُوْنِ وَصَدْرُ هٰذِهِ الأُمَّةِ وَخِيَرَتُهَا وَهُمْ أَوْلٰى بِهِ وَأَهْلُ السُّنَّةِ يَقْتَدُوْنَ وَلاَ يَبْتَدِعُوْنَ» (البداية والنهاية: ١١/ ٢٧١)

"یہ (ماتمی مجالس وغیرہ) کی رسمیں' اسلام میں ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر یہ واقعتاً اچھی چیز ہوتی تو خیرالقرون اور اس امت کے ابتدائی اور بہتر لوگ اس کو ضرور کرتے' وہ اس کے سب سے زیادہ اہل تھے (بات یہ ہے کہ) اہل سنت (سنت نبوی کی) اقتداء کرتے ہیں' اپنی طرف سے بدعتیں نہیں گھڑتے۔"

شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ

از جملہ بدعات رَفضہ کہ در دیار ہندوستان اشتہار تمام یافتہ ماتم داری و تعزیہ سازی است درماہ محرم بزعم محبت حضرت حسنین رضی اللہ عنہ..... وصور ظاہریہ ایں بدعات چند چیز است۔ اول ساختن نقل و قبور و مقبرہ و شدہ وغیرہا وایں معنی بالبداہتہ از قبیل بت سازی و بت پرستی است چہ ساختن نقل قبور از اطوار مشرکین صنم پرست است۔ حقیقت صنم پرستی ہمیں است کہ شکلے ازدست خودتراشیدہ و ساختہ و نام شخصے برآں نہادہ با اوہماں معاملہ کہ بہ اصل باید بہ آن نقل کہ چوب یا سنگ تراشیدہ است بعمل آرند..... و آنچہ اہل زمانہ باتعزیہ ہامیکنند ہرگز باقبور واقعیہ ہم بناید کردچہ جائے قبور جعلیہ وایں مبتدعان عبادت سجدہ و طواف کردہ صراحتہ خود رابسرحد شرک قبیح می رساندو شدہ و علم تعزیہ چوں مسجود و مصاف گرد وہمہ درمعنی بت پرستی است۔ (صراط مستقیم' ص:۵۹)

خلاصہ عبارت یہ ہے کہ پاک و ہند میں رافضیوں کے زیر اثر تعزیہ سازی کی جو بدعت رائج ہے یہ شرک تک پہنچا دیتی ہے کیونکہ تعزیے میں حسین رضی اللہ عنہ کی قبر کی شبیہ بنائی جاتی ہے اور پھر اس کو سجدہ کیا جاتا ہے اور وہ سب کچھ کیا جاتا ہے جو بت پرست اپنے بتوں کے ساتھ کرتے ہیں اور اس معنی میں یہ پورے طور پر بت پرستی ہے۔ اعاذنا اللّٰہ منہ

اسی طرح مولانا شہید ماہ محرم میں قصہ شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے ذکر کو بھی مذموم و مکروہ قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"ذکر قصہ شہادت بشرح و بسط عقد مجلس کردہ بایں قصد کہ مردم آں رابشنوند و تاسفہا و حسرتہا فراہم آرند و گریہ و زاری کنند۔ ہرچند در نظر ظاہرے خللے دراں ظاہر نمی شود۔ امافی الحقیقت ایں ہم مذموم و مکروہ است۔" (صراط مستقیم، ص:۶۱)



ایک لمحہ فکریہ اور دعوت غور و فکر

محرم الحرام سے مسلمانوں کے سال نو کا آغاز ہوتا ہے۔ جس سے مسلمانوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑنی چاہیے، عمل کا ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا ہونا اور شعور و توانائی کا ایک نیا احساس اُجاگر ہونا چاہیے۔

لیکن ہوتا کیا ہے؟ اس کے بالکل برعکس نالہ وشیون کی دل دوز صداؤں سے فضا سوگوار اور ماتم وعزا کی کربناک مجلسوں سے حرکت وعمل کی توانائیاں مفقود ہو جاتی ہیں۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا اس مہینے کی بابت شریعت کے کچھ احکام ایسے ہیں جن پر عمل کرنے سے مذکورہ نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ شریعت تو عمل اور حرکت واقدام کا نام ہے نہ کہ رونے پیٹنے کا، جذبوں اور ولولوں کا نام ہے نہ کہ نالہ وشیون کا اور شعور و توانائیوں کا نام ہے نہ کہ ماتم وعزا کا۔

پھر ماہ محرم میں شریعت کے مقاصد کے خلاف، دوسرے نتائج کیوں سامنے آتے ہیں؟ اس کی وجہ صرف اور صرف چند رسوم ورواج پر عمل اور بعض دیو مالائی داستانوں کو اہمیت دینا اور انہی کو سارے مذہب کا محور قرار دینا ہے۔

وہ رسوم ورواج کیا ہیں؟ اور ان داستانوں کی حقیقت کیا ہے؟ اسی کی تفصیل اس کتاب میں ہے۔ ایک حقیقت کشا کتاب، جو تاریخ کے گرد و غبار کو صاف بھی کرتی ہے اور مذہب کے نام پر رائج رسوم ورواج کی حقیقت کو بے نقاب بھی۔



دارُالسّلام
کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
ریاض • جدہ • شارجہ • لاھور
لندن • ھیوسٹن • نیویارک